اوڈی پر اسمرا یک و نشر الیمن شتاہ

زینۂ سلوک

زینۂ سلوک

شیخ محمد ریاض نفیسی ۔ ایم اے

مکتبہ سلوک و عرفان راول

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا (المزمل)

زینۂ سلوک

از شیخ محمد ریاض نقشبندی
(ایم اے)

ناشر

مکتبہ سلوک و عرفان
مین بازار حافظ آباد، راولپنڈی

نام کتاب :-	زینہ سلوک
مصنف :-	شیخ محمد ریاض نقیبی ایم اے
ناشر :-	مکتبہ سلوک و عرفان ۔ راولپنڈی
اشاعت اوّل :-	اگست ۱۹۸۲ء
تعداد	پانچصد ۵۰۰
پرنٹرز :-	شاہ ایڈ سنز پریس پرنٹرز لاہور
قیمت :-	قیمت -/۲۰ روپے

فہرست مضامین

اِنتساب

مُرشد کے نام،

جو کہ سِرِّ قدرت ہے

اور

جِسے ہر اہلِ طلب سلام کرتا ہے۔

بحضورِ مرشد

جنبشِ نوکِ قلم منت کشِ تصویرِ تو
ایں صحیفہ در حقیقت نکتۂ تفسیرِ تو

تو سراپا جلوہ باشی من سراپا انتظار
تو مرا ذوقِ فعال و من سراپا بے قرار

خامہ گشتم رقص کردم بر ورق در حرفِ یار
بر ملا رقصانیم در پائے من زنجیرِ تو

جنبشِ نوکِ قلم منت کشِ تصویرِ تو
ایں صحیفہ در حقیقت نکتۂ تفسیرِ تو

مظہرِ سرِ "ید اللہ" منظرِ اسرارِ حق
کاشفِ اسرارِ ہستی، جامعُ الانوارِ حق

حرفِ خامش را دہی یک صوت از گفتارِ حق
صوت را معنی دہد یک جلوۂ تنویرِ تو

جنبشِ نوکِ قلم منت کشِ تصویرِ تو
ایں صحیفہ در حقیقت نکتۂ تفسیرِ تو

من فنا ام نے بقا ام، من ندانم قیل و قال
من ندانم چہ جمال و من ندانم چہ کمال

معنیٔ "العشق نار" را بگو در حرفِ حال
بزم و نظمِ فکرِ من از غلبۂ تدبیرِ تو

جنبشِ نوکِ قلم منت کشِ تصویرِ تو
ایں صحیفہ در حقیقت نکتۂ تفسیرِ تو

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

تمدنِ اسلامی کئی اہم عناصر کی باہمی ترکیب و امتزاج سے متشکل اور متشخص ہوتا ہے جن میں سے تصوّف جسے طریقت اور سلوک بھی کہا جاتا ہے۔ انتہائی طور پر اہم ہی نہیں قطعاً لازم بھی ہے کہ اس کے بغیر اسلامی تمدن اور ثقافت کا تشخص نا تمام اور نا مکمل رہ جاتا ہے۔

علمائے ظاہر طریقت اور شریعت کو دینِ اسلام کی دو الگ اور جداگانہ صورتیں سمجھتے ہیں اور انہوں نے ان دونوں کو نہ صرف ایک دوسرے سے جدا بلکہ ایک دوسری کی حریف اور متناقض بھی قرار دیا ہے۔ وہ طریقت کو باطن اور شریعت کو ظاہر کہتے ہیں۔ خود اہلِ طریقت میں سے بعض انتہا پسندانہ افتادِ طبیعت رکھنے والے حضرات طریقت کو مغز اور شریعت کو پوست، شریعت کو جسم اور طریقت کو روح اور شریعت کو لفظ اور طریقت کو معنی کہہ کر اپنی انا کے لئے سامانِ تسکین مہیا کرتے ہیں اور اس طرح اپنے احساسِ برتری کو زندہ اور توانا رکھنے کی سعی فرماتے رہتے ہیں، لیکن اگر انہی کی تشریحات کو بھی پیشِ نظر رکھا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ بغیر بدن کے روح کی نمود نا ممکن ہوتی ہے بغیر لفظ کے معانی کا وجود خارج از تصوّر ہوتا ہے اور بغیر پوست کے مغز کی نشو و نما اور اس کے حقیقی جوہر کی بقا کا امکان معدوم ہوتا ہے۔ گویا شریعت اور طریقت ایک دوسری کی حریف نہیں حلیف ہیں ایک دوسری کی

نفی نہیں اثبات ہیں ایک دوسری کی ابطال نہیں احقاق ہیں۔

لفظ طریقت اور شریعت دونوں کے معنی راستے کے ہیں۔ سلوک کے معنی بھی راستہ ہی کے ہیں۔ نہ طریقت منزل ہے نہ شریعت۔ بلکہ دونوں منزل تک پہنچانے والی ہیں۔ البتہ مردِ طریقت ہو یا صاحب شریعت اگر راستے ہی کے حسن و جمال میں کھو کر رہ جائے گا تو منزل تک پہنچنا محال ہوگا۔ منزل تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ راستے سے بھٹکنے نہ پائے اور چلنے کا عمل مسلسل رہے۔ راستے کی صعوبتوں اور تکلیفوں کو خاطر میں نہ لائے بلکہ ہر صعوبت اور ہر تکلیف کو لازمۂ سفر سمجھے اور کسی تکلیف کے مداوا کے لئے سلوک کے مسلسل عمل سے غافل نہ ہو ورنہ حال وہی ہوگا کہ

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد

شریعت اور طریقت کے اس قریبی رشتے کی وضاحت اُن بزرگ اور سربرآوردہ صُوفیائے کرام کی زندگی سے بھی ہوتی ہے جو صرف اعلیٰ پائے کے صُوفی ہی نہ تھے بہت بڑے عالم، محدث اور فقیہہ بھی تھے۔ اور اُن کے زمانۂ حیات اور بعد میں آنے والے لوگوں کے لئے صرف اُن کی سیرت اور کردار ہی نہیں اُن کے علمی کارنامے بھی مشعلِ ہدایت اور سرچشمۂ بصیرت تھے۔ اس برِصغیر کے اکابر صُوفیاء جن میں حضرت داتا گنج بخش ہجویریؒ، حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ، حضرت بابا بہاء الدین زکریاؒ، حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ، حضرت خواجہ میاں میرؒ لاہوری، دہلی کے خانوادۂ محدثین کے شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ، شاہ ولی اللہ دہلویؒ، شاہ عبدالقادر دہلوی

شاہ عبدالغنیؒ دہلوی، حضرت امام ربانی شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ۔ حضرت خواجہ گیسو درازؒ گلبرگہ، حضرت شاہ جلالؒ تھانیسری، اور قریبی دور کے حضرت شمس الدین سیالویؒ، سلطان العارفین حضرت سلطان باہوؒ، حضرت پیر جماعت علی شاہ علی پوریؒ، حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑویؒ جیسی برگزیدہ اور جلیل القدر ہستیاں شامل ہیں سب کے سب اکابر علماء بھی ہیں۔

برصغیر سے باہر سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ۔ حضرت خواجہ عبداللہ انصاری ہرویؒ، شیخ شہاب الدین سہروردیؒ، حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبندؒ، حضرت امام غزالیؒ، بابا فریدالدین عطارؒ، فلسفۂ وحدت الوجود کے داعی جناب محی الدین ابن عربیؒ جنہیں شیخ اکبر بھی کہا جاتا ہے، سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ۔ مولانا جلال الدین رومیؒ۔ شیخ سعدی شیرازیؒ، شیخ ابی سعید ابی الخیرؒ، مولینا نورالدین عبدالرحمٰن جامیؒ، اور بہت سے دیگر صوفیائے کرام بھی علماء میں کاملین کا درجہ رکھتے ہیں۔

شریعت اور طریقت کو استعارۃً علم اور عشق بھی کہا جاتا ہے۔ اہل تصوف عشق کو علم پر ترجیح دیتے ہیں کیونکہ علم کا تعلق حواسِ ظاہری سے ہوتا ہے جبکہ عشق کا تعلق براہ راست باطنی جذبوں سے ہے۔ اقبال نے علم اور عشق کا تقابل بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے ــــ وہ کہتے ہیں۔

علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن
عشق نے مجھ سے کہا علم ہے تخمین و ظن
بندۂ تخمین و ظن کرم کتابی نہ بن

علم اور عشق کا تقابل اسی نظم میں ایک مصرع میں نہایت خوبصورت انداز

انداز میں کیا گیا ہے۔

ع علم ہے ابن الکتاب، عشق ہے اُم الکتاب

تاہم یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ علم کی اپنی فتوحات ہیں اور عشق کی اپنی فتوحات ہیں۔ علم سے ابوالہول بنتے۔ اہرام مصر ظہور میں آتے، قلعے اور محل تعمیر ہوتے ہیں لیکن عشق سے تاج محل، مسجد قرطبہ اور شعر و ادب کے ایوان وجود میں آتے ہیں۔ علم کا تعلق چونکہ انسانی ذہن سے ہے اور یہی ذہن انسانی مقام عقل بھی ہے اس لئے علم اور عقل کو توام سمجھا جاتا ہے۔ کچھ کر گزرنے کا مقام آتا ہے تو عشق ہی کام آتا ہے۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

تاہم اہل بصیرت عقل کو حیلہ جو اور بہانہ ساز سمجھتے ہوئے بھی مردود و مقہور نہیں سمجھتے بلکہ اس کی نورانیت کے معترف ہیں۔ البتہ اُسے منزل قرار نہیں دیتے صرف منزل کا راستہ دکھانے والی قوت سمجھتے ہیں۔

گذر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے

شریعت و طریقت اور عقل اور عشق کے بارے میں مندرجہ بالا سطور اس لئے تحریر میں آئی ہیں کہ میرے سامنے اس وقت ایک مختصر لیکن جامعہ تصنیف "زینۂ سلوک" ہے جو اس لحاظ سے چراغ راہ ہے کہ ہمیں منزل کا راستہ دکھاتی ہے لیکن اس کی اپنی حیثیت چراغ راہ سے آگے نے ہے اور اس کے خط و خال میں منزل کے نقوش بھی ملتے ہیں۔ اس کتاب کے مصنف ریاض نقیبی ایک ایسے جوان رمز آشنا ہیں جو منزل پیری کے قریب نظر آتے ہیں۔ وہ بظاہر

ایک خاموش طبع پُرسکون مزاج کے انسان ہیں لیکن ان کے اندر ایک بے چین روح نے شوق و اضطراب کا طوفان برپا کیا ہوا ہے۔ اُن کی یہ بے چین روح اپنی منزل کی تلاش میں ہے۔ مگر منزل تک جانے کے لئے جس رہنما کی لعانت لازم ہے وہ اس دور میں ناپید ہو گیا ہے۔ جن حلقوں کے اندر ایسے رہنما کے دستیاب ہونے کے امکانات اور توقعات ہوتی ہیں وہ حلقے چاہے خانقاہی ہوں چاہے مکتبی چاہے شعر و سخن کے ہا مردان کار سے خالی ہو چکے ہیں۔ بقولِ اقبال۔

سبوئے خانقاہاں خالی از مے
کُند مکتب رہِ طے کردہ را طے
ز بزم شاعراں افسردہ رفتم
نواہا مُردہ بیروں افتد از نَے

محرومی کے دورِ حاضر میں ایسے افراد کو جن کے سینوں کے اندر قدرت نے بے چین دل اور جن کے پیکراں میں مضطرب روحیں رکھ دی ہیں وہ عجیب بے چینی اور دلِ دریدگی کے عالم میں ہیں اور اُن پر اضطراب کا جو عالم طاری ہوتا ہے اور اضطرار کی جن حالتوں سے وہ گزرتے ہیں اس کے متعلق اقبال نے اس طرح کہا ہے۔

بہ آں قوم از تو می خواہم کشادے
فقیہش بے یقینے کم سوادے
بسے نادیدنی را دیدہ ام من
مرا اے کاشکے مادر نزادے

اضطرار اور اضطراب کے اس عالم میں جب کہ کفر و الحاد کے قمقمے ہر طرف روشن ہیں اور باطل پرست اقوام کی مادی اور سائنسی قوتوں نے مضبوط اور

مستحکم فانوس بن کر ان قمقموں کو اپنی پناہ اور عاطفت میں لیا ہوا ہے ایمان و ایقان کے چراغ وقت کی تند و تیز آندھیوں کے سامنے بے بس اور مجبور نظر آرہے ہیں۔ اور اگرچہ یہ چراغ اب تک جھلملا اور ٹمٹما رہے ہیں تاہم کفر و باطل کی آندھیوں میں تندی و تیزی بڑھتی چلی جا رہی ہے اور یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰہِ بِاَفْوَاهِهِمْ (التوبہ) کا سماں نظر آرہا ہے۔ متذبذب اور متشکک اذہان و قلوب باطل قوتوں سے مرعوب اور مرھوب ہو رہے ہیں جن کی وجہ سے انہیں نہ اپنی منزل صاف نظر آرہی ہے نہ اپنا مستقبل۔

تاہم اضطرار و اضطراب کے اس عالم اور درد و کرب کے اس بے پناہ ہجوم میں خدا کے فضل و کرم سے مسلمانوں کے اندر ایک مختصر سا طبقہ اہلِ یقین کا ایسا موجود ہے۔ جو مندرجہ بالا آیۂ کریمہ کے بقیہ کلماتِ حق وَیَاْبَی اللّٰہُ اِلَّآ اَنْ یُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ہ پر یقین کامل رکھتا ہے ہماری ملی تاریخ میں ایک زمانہ ایسا بھی ہمارے ماضی قریب میں گذرا ہے جب یقین کا نور وساوس و اوہام کی ظلمتوں میں تقریباً گم ہی ہو چکا تھا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ ذہنی ظلمت زدگی کا وہ دور گزر چکا ہے اور اب ایمان و ایقان کا نور رفتہ رفتہ بڑھتا چلا جا رہا ہے اور ہر چند کہ کفر و شرک کی قوتیں اپنے عزائم اور اپنے منصوبوں میں زیادہ مستعد اور زیادہ سرگرم ہو گئی ہیں۔ لیکن اہلِ ایمان و ایقان بھی وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ کے فرمودہ ربانی کی حقانیت کے زیادہ سے زیادہ رمز آشنا ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

نورِ حقیقت کے اتمام اور مکارمِ اخلاق کے اتمام کا تعلق لازم و ملزوم کا ہے۔ خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بابرکت ہاتھوں سے اس نور کے اتمام کی برکات اس طرح ظہور میں آئیں کہ آنحضور نے اپنی تعلیماتِ مقدسہ

اور اپنے اسوۂ حسنہ کی عملی مثال سے ایک ایسا معاشرہ قائم کیا جو مکارم اخلاق کی صفات سے متصف اور آراستہ تھا۔ تزکیۂ اخلاق کی جو تعلیم آنحضورؐ نے مومنین کو دی اسی تعلیم کو صوفیائے کرام نے بعد کے زمانوں میں بھی جاری رکھا اور رشد و ہدایت کا یہ سلسلہ آج تک جاری ہے اور انشاءاللہ تعالیٰ ابد تک جاری رہے گا۔

ہمارے جوانِ رمز آشنا شیخ ریاض یقینی نے اسی سلسلۂ مکارم اخلاق کو اپنی ذہنی اور روحانی منزل قرار دیا ہے اور یہ منزل چونکہ نہایت ارفع اور بلند ہے اس لئے اس تک پہنچنے کے لئے انہوں نے "زینۂ سلوک" بنایا ہے۔ اس زینے کے کئی درجات ہیں، مگر یہ درجات عام زینوں کی طرح مساوی الفاصلہ نہیں۔ اس کا آغاز انہوں نے حقیقت راہِ سلوک سے کیا ہے۔ کیونکہ جب تک اس راہِ سلوک کا ادراک نہ ہو اس پر قدم رکھنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ حقیقت راہِ سلوک سے وہ مقصدِ تخلیق انسان کی طرف آتے ہیں۔ اور چونکہ از روئے قرآن تخلیق کا مقصد ہی عبادت ہے اس لئے عبادت کے ہمہ جہتی مفہوم کا سمجھنا ضروری ہے کیونکہ انسانی عبادت کا الہیاتی تصور یہ ہے کہ ہر لمحہ عبادت ہے اور ہر کام کا انداز عبادت کا سا ہونا چاہیئے۔

تاہم مصنف کی نگاہ میں عبادت کے اسرار و رموز سے آگاہ کرنے کے لئے مرشد کا وجود لازمی ہے ہرچند کہ مرشدِ کاملؐ کی تعلیمات ہمارے سامنے موجود ہے اور آپؐ کا اسوۂ حسنہ ایک کھلی کتاب کی طرح ہماری نظر کے سامنے ہے اور ہرچند کہ سرچشمۂ ہدایت جو مرشد کاملؐ نے ہمارے لئے چھوڑا وہ تمام و کمال اسی صورت میں ہمارے پاس ہے لیکن ان تعلیمات سے آگاہ کرنے آنحضورؐ کے اسوۂ حسنہ کا عرفان دلانے اور سرچشمۂ ہدایت سے فیض یاب

ہونے کے لئے اس کے مفاہیم کے سمجھانے کی خاطر کسی وجود کا موجود ہونا انتہائی ضروری ہے۔ قرآنِ حکیم، احادیث، اور سیرت کی تعلیم و تدریس کے لئے اساتذہ کی کمی نہیں لیکن ہدایت معانی اور مفاہیم کو دوسروں کے قلب و شعور میں اتارنے کا کام وہی کر سکتا ہے جو بصارت کے ساتھ بصیرت، دانش کے ساتھ بینش، اور آگاہی کے ساتھ خود آگاہی اور خدا آگاہی بھی رکھتا ہو۔ جو محض دریائے علم کا تیراک ہی نہ ہو دریائے حقیقت کا غوّاص بھی ہو۔ مادّیت کے اس دور میں ایسی شخصیتیں کم بلکہ شاذ ہیں اور جو شاذ ہیں بھی وہ اپنے آپ کو دنیا سے اوجھل رکھنا ہی زیادہ پسند کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کی دنیا میں اور سب کچھ مل جاتا ہے مُرشد نہیں ملتا۔ ریاض نقیبی کو البتہ کوئی مرشد ضرور مل گیا ہے جن کے نام انہوں نے اپنی اس کتاب کو معنون کیا ہے تاہم اُن کے رشکِ محبت کا عالم یہ ہے کہ انہوں نے کتاب کے انتساب کے باوجود مُرشد کے نام کو پردۂ اخفا ہی میں رکھا ہے۔

ہمارے اس دور کا المیہ صرف یہی نہیں کہ مُرشد نہیں ملتا۔ المیہ یہ بھی ہے کہ علوم ظاہر تک پہنچانے والے اچھے اُستاد بھی نہیں ملتے، مدرسے، کالج، ادارے، دارالعلوم، قریباً سب کے سب کاروباری مرکز بن گئے ہیں جہاں طالبین کے ہاتھ علم بیچا جاتا ہے لیکن فروخت کے اس عمل میں فروشگار دیانت کے ابتدائی اصولوں تک کی پرواہ نہیں کرتے جس کا سبب یہ ہے کہ وہ اَوْفُوا الْکَیْلَ اِذَا کِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِیْمِ کے فرمان سے محض بے خبر ہوتے ہیں۔ خرید و فروخت کا یہ کاروبار زیادہ تر دنیوی علوم تک محدود ہوتا ہے۔ دینی علوم کے طالبین ہی کم ہیں اور دینی علوم کے اساتذہ تو اور بھی کم ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دین کا علم آج بھی جبکہ پاکستان کو وجود میں آئے ہوئے

تہائی صدی سے زیادہ عرصہ گذر چکا ہے بہت کم اور محدود ہے۔ اور "اسلامیات" کو تعلیم کا ایک لازمی مضمون بنانے کی وجہ سے اگر کچھ ہے بھی تو بہت سطحی اور ناقص قسم کا۔

علم دین عام بھی ہونا چاہیئے اور لوگوں کے قلب و دماغ کے اندر جذب ہو جانے والا بھی۔ ایسا علم مدرسوں اور معلموں کے ذریعے نہیں پھیل سکتا۔ ایسے علم کو پھیلانے کے لئے مرشدوں کی ضرورت ہوتی ہے جو خبر سے کم اور نظر سے زیادہ فیض یاب کرتے ہیں۔ البتہ اس نکتے کو فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ علم خبر کے بغیر علم نظر سے ہی فرد کی انفرادی اور قوم کی اجتماعی تربیت نہیں کی جا سکتی علومِ باطن کے حصول کے لئے علومِ ظاہر کا حاصل کرنا ضروری ہے۔ صرف انبیائے کرام کے نفوسِ قدسیہ ہی ایسی شخصیتیں ہوتی ہیں جن کو علوم ظاہر کی تحصیل سے مستغنی کر دیا جاتا ہے کیونکہ انہیں الہام اور وحی کے ذریعے ان تمام علوم سے متصف کر دیا جاتا ہے جو اُن کے منصبِ نبوت کے لئے درکار ہوتے ہیں۔

چونکہ الہام اور وحی کے ذریعے معلمِ ازل سے براہ راست علوم اخذ کرنے کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے اس لئے اب علوم باطن حاصل کرنے کے لئے علوم ظاہر کا حاصل کرنا بھی ضروری ہے۔ اللہ کے خاص بندوں کو چونکہ نہایت لطیف حسیات اور غیر معمولی ذہانت و فطانت عطا کی جاتی ہیں اس لئے وہ مدارجِ علم کے طے کرنے میں بہت تیز ہوتے ہیں اور علم کے ساتھ ساتھ عرفان بھی ان کی رگ و پے میں بڑی تیزی سے سرایت کرتا ہے۔ صرف جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے ان کی تعلیم اور رہنمائی کے لئے اچھے اساتذہ کی ضرورت ہے۔

تصوف میں جب مرشد مل جائے تو عشق حقیقی کی منزل تک پہنچنے کے لئے عشقِ مجازی ایک اہم بلکہ تقریباً ناگزیر ضرورت ہے۔ عشقِ مجازی میں مرشد کی ذات محبوب ذات ہوتی ہے۔ اور عاشق کے لئے تصورِ شیخ کا مرحلہ

طے کرنا لازمی ہوتا ہے۔ مصنف نے اس کی مناسب تشریح کی ہے۔ اور یکسوئی حاصل کرنے کے لئے ذکر و اذکار کی تفصیل بھی دی ہے۔ ذکر اہلِ تصوف کے لئے ایک ایسی ریاضت ہے جو انہیں اپنے محبوب کا محبِ کامل بنانے میں بہت مددگار ثابت ہوتی ہے۔ ذکر فکر کا پیش خیمہ ہے۔ اس لئے یہ ریاضت ذکرِ جہر سے شروع ہو کر ذکرِ خفی تک پہنچتی ہے اور ذکرِ خفی آہستہ آہستہ فکر کے سانچے میں ڈھلتا جاتا ہے۔ تاہم فکر کی منزل پر پہنچ کر بھی ذکر کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا بلکہ ذکرِ جہر سلوک کی ہر منزل میں ایک "تلازمے" کی حیثیت سے ناگزیر ہوتا ہے۔ ریاض نقیبی نے اس نکتے کو بڑی خوبی سے واضح کیا ہے۔

ذکر و فکر کے عمل میں حائل ہونے والی سب سے بڑی رکاوٹ نفسانیت ہے۔ نفسِ انسانی اُسے خواہشات کے جال میں اسیر کر کے اس کی روحانیت کو فنا کرنے کے درپے ہوتا ہے۔ تاہم شیطانی اور حیوانی خواہشات اور فطری انسانی حاجات میں واضح امتیاز موجود ہے۔ فطری حاجات کا پورا کرنا فرائضِ انسانی میں شامل ہے۔ لہذا اپنے اور اپنے متوسلین کے لئے رزقِ حلال پوشاک اور مناسب ٹھکانا حاصل کرنے کی کوشش ایک عام انسانی فریضہ ہی نہیں عبادت ہے۔ معاش کے لئے محنت کرنا فضائلِ انسانی میں شامل ہے اور کام کر کے روزی کمانا اللہ کی خوشنودی کا باعث ہوتا ہے۔ اسی لئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ اَلْکَاسِبُ حَبِیْبُ اللّٰہ اور یہ بھی فرمایا ہے کہ لَا رَھْبَانِیَۃَ فِی الْاِسْلَامِ۔

صوفیائے اسلام خواہشات کو کبھی غالب نہیں آنے دیتے کیونکہ خواہشات کے ایندھن سے صبر و توکل حق طلبی اور رضا جوئی اور اسی طرح کے دیگر فضائلِ انسانی جل کر خاکستر ہو جاتے ہیں۔ وہ خواہشات کے غلام نہیں بنتے خواہشات

کو غلام بنا لیتے ہیں۔ خواہشات نفسانی اور خواہشات شیطانی کے بارے میں بھی قابل مُصنّف نے نہایت متوازن اور انتہائی معتدل اندازِ نظر اپنایا ہے۔ چنانچہ ہمارے بڑے بڑے عظیم صُوفیائے نے حلاجی، آہن گری، زرکوبی، غزالی، باغبانی، نجاری اور اسی طرح کے دوسرے مشاغل حیات اختیار کرکے نہ صرف اپنے اور اپنے متوکلین کے لئے رزقِ حلال مہیا کرنے کا اہتمام کیا ہے بلکہ ساری اُمتِ مسلمہ کے لئے محنت کشی اور ہمت کوشی کی اعلیٰ مثالیں بھی قائم کی ہیں۔ کتاب کے ایک باب میں مصنف نے ان پہلوؤں پر اچھی طرح روشنی ڈالی ہے۔

اس مسوّدہ پر یہ مختصر سا دیباچہ لکھنے سے پہلے میں نے کچھ عرصہ اس کا بالاستیعاب مطالعہ کیا تھا اور جہاں جہاں کوئی نکتہ وضاحت طلب یا افراط و تفریط کا شائبہ نظر آیا میں نے وہاں وہاں نشان دہی بھی کی۔ مجھے خوشی ہے کہ مصنف نے اپنے کسی خیال پر اصرار کرنے کی بجائے میرے مخلصانہ مشوروں کو قابل اعتنا سمجھ کر اُن پر عمل بھی کیا۔ مثلاً میں نے کہا تھا کہ استغراق کا مقصد کامل یکسوئی اور ہمہ توجہی ہے تاہم استغراق کے باوجود سالک حواس ظاہری کو ترک نہیں کرتا۔ استغراقِ حقیقی کے دوران سالک پر حالت صحو رہتی ہے، حالتِ سُکر نہیں ہوتی۔ سکر عبادت اور ذکر میں خلل انداز ہوتا ہے جبکہ سلوک ہمہ وقت خدا کے راستے میں چلتے رہنے کا نام ہے۔ سُکر غفلت پیدا کرتا ہے اور سلوک کے لئے زہر قاتل کا درجہ رکھتی ہے۔ یہاں تک ایک لمحے کی غفلت بھی بعض اوقات سال ہا سال کی محنت کو ضائع کرکے رکھ دیتی ہے۔ تصوّف اسلامی زندگی اور حرکت کا نقیب ہے اور زندگی ہمہ وقت صحو کا نام ہے یہاں تک کہ درویشِ کامل وہ ہے جس کا دل عالم خواب میں بھی معروفِ ذکر رہتا ہے۔ اقبال فرماتے ہیں۔

زندگی از گرمیٔ ذکر است و بس
حرّیت از عفّتِ فکر است و بس
چوں شود اندیشۂ قومی خراب
ناسرہ گردد بدستش سیم ناب

سکر نو افلاطونی فلسفۂ حیات کا ثمرہ ہے۔ اور اسی فلسفۂ حیات نے مسلمانوں کی حرکت و عمل کی قوتوں کو ماؤف کر کے اُنہیں اِس عالم آب و گل میں درماندہ اور کمزور کر دیا تھا۔ حضرت علامہ نے اسرارِ خودی میں اِس فلسفۂ زندگی کو نہایت سخت تنقید کا ہدف بنایا ہے۔

فکر افلاطون زیاں را سود گفت
حکمتِ او بود را نابود گفت
قوم ہا از سکرِ او مسموم گشت
خفت و از ذوقِ عمل محروم گشت

سکر اور استغراق کے مابین جو نہایت لطیف لیکن واضح فرق ہوتا ہے تصوّف پر عمل کرنے والے ہر فرد پر روشن ہونا چاہیئے۔ مجھے خوشی ہے کہ ریاض نقیبی اِس فرق سے آگاہ کریں۔ اور انہوں نے زیرِ نظر کتاب میں ثابت کیا ہے کہ اِس مسئلہ پر اُن کی ذہنی گرفت کمزور نہیں۔

سکر و صحو کے ساتھ ساتھ فاضل مصنف نے جذب و جنون کا جائزہ بھی لیا ہے اور اِسے "راہ سلوک کا خوش آئند لیکن خطرناک موڑ" کہا ہے اور یہ اِس لئے کہ اِس کیفیت کے ساتھ سوائی اور شیطانی عناصر کی مداخلت کا امکان بھی لازماً ہوتا ہے۔

یہ وہی خطرناک موڑ ہے جہاں مُرشد کامل کی دستگیری انسان کو گمراہ ہونے

سے بچاتی ہے اور جسے مُرشدِ کامل کی رہنمائی نصیب نہ ہو وہ گمراہی کی حد سے بھی آگے نکل کر کفر کی ظلمتوں میں جا سکتا ہے۔

جذب و جنون کی کیفیت اور اس کیفیت کے خطرناک ردِّ عمل سے محفوظ رکھنے کی ایک روشن مثال شیخین معظم حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا وہ واقعہ ہے جو آنحضورؐ کے وصال پر ظہور پذیر ہُوا۔ فرطِ محبت کی بنا پر حضرت عمرؓ پر جذب جنون کی کیفیت طاری ہوئی کہ آپ شمشیر برہنہ لئے یہ کہتے ہوئے اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے کہ جو شخص کہے گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے ہیں میں اس کا سر قلم کر دوں گا۔ سب لوگ ان کے جلال سے سہمے ہوئے تھے اس وقت اگر کوئی شخص اُنہیں ٹوکنے کی حماقت کرتا تو ہو سکتا تھا کہ عمرؓ کے ہاتھوں ایک مسلمان کا خونِ ناحق ہو جاتا جو اُن کے لئے باعث خسر الدنیا والآخرۃ ہوتا۔ ایسے وقت میں رُشد و ہدایت کا راستہ دکھانے والی وہ ہستی نمودار ہوئی جسے ابو بکر صدیقؓ کہا جاتا ہے۔ آپ نے حضرت عمرؓ سے الجھنے کی کوشش نہ کی بلکہ باآوازِ بلند یہ آیت تلاوت فرمائی۔

وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِنْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ ... الخ (آل عمران-۱۴۴)

اس آیت کی تلاوت نے عمر فاروقؓ کی آتشِ جلال پر آبِ رحمت کا کام کیا۔ تلوار نیام میں چلی گئی اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے درویش نما انسان بعض اعمال و اوراد کے طفیل جب جذب و جنون کی بعض کیفیتوں کے مورد ہوتے ہیں تو جذبہ بے اختیار شوق کے باعث شمشیر کا دم سینہ شمشیر سے باہر نکلنے لگتا ہے۔ اور وہ ایسی

ایسی باتیں کرنے لگتے ہیں جو کفر کے زمرے میں آتی ہیں۔ ایسے خام اور ناتمام قسم کے لوگ دوسروں کی رہبری اور رہنمائی کا دم بھرنے لگتے ہیں حالانکہ بیچارے خود رہنمائی بلکہ دستگیری کے محتاج ہوتے ہیں۔

اس کتاب میں ایک نہایت انوکھا باب "وہم الیقین" کے عنوان سے بھی موجود ہے۔ میں نے اسے انوکھا اس لئے کہا ہے کہ بادی النظر میں کوئی انسان یا تو وہم میں مبتلا ہو سکتا ہے یا مقام یقین پر فائز ہو سکتا ہے۔ لیکن ذرا بنظرِ غائر دیکھیں تو ایک کیفیت یہ بھی ہوتی ہے کہ انسان یقین کے درجے پر فی الواقعہ تو نہ پہنچا ہوا ہو لیکن اُسے وہم ہو کہ وہ ایسا ہو چکا ہے۔

ہمارے بعض بلکہ اس زمانے میں بڑی تعداد میں متصوفین ایسے ہوتے ہیں جن کے ظرف دو چار گھونٹ میں ہی چھلک جاتے ہیں۔ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کے اندر کچھ نہیں ہوتا مگر وہ خالی برتن کی طرح آواز زیادہ نکالتے ہیں۔ انہی لوگوں میں وہ لوگ بھی شامل ہوتے ہیں جو مکر و زور کا جامہ پہن لوگوں کو مبتلائے فریب کرتے ہیں اور مکر و فریب کے ذریعے بے شمار فوائد حاصل کرتے ہیں۔ ایسے اشخاص صریحاً کاذب ہوتے ہیں اور اپنے عمل سے نہ صرف لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں بلکہ اُمت کے عقائد میں ایسی رخنہ اندازیاں کر جاتے ہیں کہ مدتوں بلکہ کبھی کبھی صدیوں تک ان کا ازالہ نہیں ہو سکتا۔

اس قسم کے لوگوں کے بارے میں ریاض نقیبی صاحب سے میرا تبادلۂ خیالات ہوتا رہا اور اس تبادلۂ خیالات کے نتیجے میں انہوں نے مذکورہ باب کو از سرِ نو مرتب کر کے مفاہیم و معانی کو بڑے صاف اور واضح انداز میں پیش کیا ہے۔

میں نے اپنے پیش لفظ میں جن نکات کا ذکر کیا ہے اُن کے علاوہ بھی فاضل

مصنف نے کئی نکات پر قلم اٹھایا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ پڑھنے والے کو کتاب کے کئی مندرجات سے اتفاق نہ ہو۔ ہو سکتا ہے کہ کسی شخص کی نظر میں بعض چیزیں قابلِ بحث ہوں تاہم ہر پڑھنے والا محسوس کرے گا کہ لکھنے والے کا اپنا ذہن صاف ہے اور اُس نے جو کچھ لکھا ہے اُس میں سے بیشتر مشاہداتی بلکہ وارداتی ہے اور اس کا ایک ایک لفظ خلوص و دیانت کا آئینہ دار ہے

نظری تصوف پر اردو میں کتابیں کم لکھی گئی ہیں اور جو ہیں وہ بھی زیادہ تر فارسی اور عربی زبانوں سے ترجمہ ہو کر ہمارے ہاں آئی ہیں ۔ اس صورتِ حال میں زیرِ نظر کتاب ایک خوشگوار اور دلچسپ علمی اور ادبی کارنامہ ہے اور اہلِ دانش اس سے یقیناً فائدہ اٹھائیں گے۔

فقط

کرم حیدری

۲۰ ربیع الاول ۱۴۰۱ھ

۹-بی سٹلائٹ ٹاؤن ـــ راولپنڈی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض حال

الحمد للہ رب العلمین۔ والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الکریم۔ وعلی آلہ واصحابہ اجمعین ٥ اما بعد

اسلامی تصوف کی اصطلاح میں راہِ سلوک سچائی کی ایسی راہ کو کہا جاتا ہے جو اکتساب عرفان میں معاون ہو۔ اور سالک اس راہ کے طالب و مسافر کو، خواہ اس کا شمار بظاہر پیروں فقیروں اور درویشوں میں ہوتا ہو یا وہ ایک عام سیدھے سے انسان کی طرح اسلامی طرزِ معاشرت کے مطابق متحرک زندگی گزارتے ہوئے مقاماتِ سلوک میں رواں دواں ہو۔ اسلامی راہِ سلوک کا حیاتِ عنصری کے ساتھ نہایت ہی گہرا رابطہ استوار ہے کیونکہ اسلام عین دینِ فطرت ہے۔ ظاہر اور باطن باہم لازم و ملزوم بھی ہیں اور ایک دوسرے کے معاون بھی۔ نیز جوں جوں مشاہدہ کیا جائے ان کی باہمی سطحی تفریقات کے پردے چاک ہوتے چلے جاتے ہیں اور دین کی روح سے آگاہی ہوتی ہے۔ دین کی وہ روح جو عشقِ حقیقی سے معمور ہے اور جس سے آگاہی ہمارے معاشرے کی ضرورت ہے۔ عارفینِ اسلام نے قرونِ اولیٰ سے لیکر دورِ حاضرہ تک دین کی اس روح کو پیش کرنے میں گراں بہا خدمات سرانجام دیں۔ یہ بندۂ خاکسار بوسیلۂ مرشدِ پاک ان تمام اسلاف کی ارواحِ مقدسہ کو ہدیۂ سلام پیش کرتا ہے جنہوں نے قولی فعلی نظری اور قلمی ذرائع ابلاغ سے تشنگانِ حقیقت کے دلوں میں عرفانِ توحید کی شمع روشن کی، لوگوں کے سینوں کو تعصبات سے پاک کیا اور دینی حقائق سے آگاہ کیا۔

تاہم زمانہ کی پیش رفت بدلتے ہوئے ادوار کے تقاضوں اور علمی نظریہ فعالیت کو مدِ نظر رکھا جائے تو ایسے معلوم ہوتا ہے کہ تعلیماتِ سلوک کی وضاحت میں قابلِ غور خلاء پایا جا رہا ہے۔ گردشِ ایام کے علاوہ اس خلاء کا قدرتی سبب فکر و عمل سے تعلق رکھنے والے معاملاتِ حال کے پیچیدہ مسائل بھی ہیں

جن سے نظری آگاہی حاصل کرنے کیلئے حال وارد ہونا لازم ہے۔ حال وارد ہونے کیلئے جذب و استغراق یا مختلف باطنی کیفیات اور مشاہدات ہی کافی نہیں بلکہ معاملہ کچھ اور بھی ہے۔ حال آگاہی ان کیفیات قلبی کا نام ہے جبکہ واردات اور مشاہدات پر بھی تحقیق اور تصدیق حاصل ہو۔ اور اصل امر کا ادراک ہو جائے کہ ظاہر اور باطن ایک دوسرے کے معاون ہیں۔ اس لحاظ سے راہِ سلوک بلاشبہ خالصتاً ایک عملی معاملہ ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ فکر عمل کی بنیاد ہے۔ اکتسابِ خیر کیلئے خطوطِ افکار کے پیچ و خم سے آگاہی لازم ہے تاکہ افکار راستی پذیر ہو سکیں اور عمل میں صحت اور خلوص قائم ہو نیز عقلِ سلیم عشقِ مستقیم سے بہرہ ور ہو سکے اور علم عرفان سے۔ خاکسار کے ذہن میں ایسا کوئی خیال نہ تھا کہ سلوک و تصوف کے اس عمیق ترین موضوع پر قلم اٹھانے کی جسارت کرے۔ یہ ایسا معاملہ بھی نہیں کہ جس پر محض احباب ہی کی فرمائش کے مطابق عمل پر آمادگی ہو جائے۔ اصولی طور پر نہ ہی جذبہ شوق کو جسارت ہو سکتی ہے اور نہ ہی اکتسابی علوم کے ذوقِ تحقیق کو۔ البتہ مرشدِ پاک (جو کہ سرِّ قدرت ہے) کی نگاہ بصیرت افروز معاونِ ابلاغ ہو جائے تو فضلِ ربانی شاملِ حال ہوتا ہے۔ نتیجتہً مشکل کو سہل اور نااہل کو اہل کر دیا جاتا ہے اور حرفِ خاموش کو بھی تابِ گویائی عطا ہوتی ہے۔

"زینۂ سلوک" کے عنوان سے لکھی جانے والی کتاب ہذا دراصل سوزِ عمل کی ایک پکار ہے۔ اس میں زیادہ تر راہِ سلوک کے سفری معاملات پر تبصرہ آرائی کی گئی ہے تاکہ راقم سطور اور قاری دونوں کیلئے فکر و عمل کی راہ شفاف ہو سکے۔ حیات خود ایک سفر ہے۔ سفری معاملات حیاتِ عنصری کے عبادتی امور سے بھی متعلق ہوتے ہیں اور باطنی افکار اور فکر و نظر سے بھی۔ اس امر کی کوشش کی گئی ہے کہ سلسلۂ ترتیب کی مطابقت سے کتاب کے بعض مضامین بعض کی وضاحت میں معاون ہوتے چلے جائیں۔ بعض مندرجات ایسے بھی ہیں کہ جن کے پہلی بار یا سرسری مطالعہ سے قارئین کو مفاہیم سے اجنبیت کا احساس ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کا مطالعہ سلسلۂ ترتیب کے مطابق یکسوئی کے ساتھ بنظرِ غائر کیا جائے۔ اگر اس کے باوجود قاری کو کچھ مندرجات کی وضاحت میں تشنگی کا احساس ہو۔ کسی جگہ خلا محسوس ہوتا ہو یا خلا رہ گیا ہو تو اس کو لازمۂ بشریت سے تعبیر

کیا جائے۔ اس لئے کہ بعض کیفیاتی اور مشاہداتی معاملات راہنمائی کے محض دلائل بنتے ہیں۔ مگر ان معاملات کی مکمل وضاحت احاطۂ عقل و بیان سے باہر ہوتی ہے۔ بعض معاملات ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جن کی وضاحت بقدرِ حاجت ہی ہو سکتی ہے یعنی یہ کہ جہاں تک صاحبِ کلام کو معاملہ پہ کلام کی گنجائش نظر آتی ہو۔

خاکسار اپنے ان بزرگوں، دوستوں اور دیگر ان تمام حضرات کا تہہ دل سے شکر گزار ہے جنہوں نے مسودہ کتاب کی ترتیب و عبارت اور طباعت و اشاعت کے بارے میں مخلصانہ مشورے دئے۔ محترم پروفیسر کرم حیدری صاحب نے جس عمیق النظری کے ساتھ مسودہ کتاب کا بالاستیعاب مطالعہ کیا اور جس مشفقانہ انداز سے اپنی قابلِ قدر آراء سے مستفیض کرنے کے بعد اس کا پیش لفظ تحریر فرمایا ان کی یہ مخلصانہ کاوش اور دینی خدمت کا حسن تجمل بجا طور پہ تذکرہ اور اعتراف کے لائق ہے۔ مسودہ کی تیاری کے دوران فضل الرحمٰن عظیمی صاحب اور سید مہتاب شاہ صاحب، دونوں حضرات کی طرف سے حوصلہ افزائی اور ان کے پرخلوص مشوروں کے نتیجہ میں خاکسار کو نقطہ نظر کی وضاحت میں مزید تقویت حاصل ہوئی۔ سالک رمز آشنا شاہ صاحب مذکور کی مخلصانہ معاونت اور دلچسپی برائے طباعت کتاب تا حرفِ تحریر بدستور برقرار رہی جسے حُبّ دین کا خاص جذبہ کہا جا سکتا ہے۔

آخر میں یہ خاکسار اپنے محسن اور پیشوائے طریقت زبدۃ العاشقین مردِ صفا پاش حضرت خواجہ نقیب اللہ شاہ صاحب مدظلہ (مقیم نقیب آباد قصور شریف) کا ذکر خیر کئے بغیر نہیں رہ سکتا جن کی نسبت بیعت کے وسیلہ سے من کی دنیا کو سوز و عمل کا خاص عنوان حاصل ہوا، جن سے ملنے والا تصور بندۂ ناچیز کے لئے سرمایۂ حیات، جلوہ مرشدیت، رمز خضریت اور سرِّ محمدیت ہے۔



زبدۃ العاشقین

قدوۃ السالکین

پیشوائے طریقت

حضرت خواجہ

نقیب اللہ شاہ صاحب

مدظلہٗ العالی

قادری ابوالعالی جہانگیری

خاکسار دعا گو ہے کہ باری تعالیٰ اپنے خاص فضل و کرم اور اپنے خاص بندوں کے وسیلہ سے اس کتاب کے پڑھنے والوں کو (جن میں راقم سطور بھی شامل ہے) اس کے مندرجات پر عمل پیرا ہونے اور اس کے معمولات پر قائم رہنے کی توفیق عطا فرمائے ——— (آمین)

بندۂ نیازمند

(خادم العاشقین) شیخ محمد ریاض نقیبی

۱۰۱ - جی، ایمبرج فیکٹری کالونی، راولپنڈی

۱۰ ربیع الثانی ۱۴۰۲ھ

بمطابق ۵ فروری ۱۹۸۲ء

حقیقتِ راہِ سلوک

راہِ سلوک سے مراد سچائی کی راہ ہے جس پر گامزن ہو کر اکتسابِ عرفان میں کاوش کی جاتی ہے۔ سچائی کی ایسی راہ جو عملی طور پر مقاصدِ قرآن و سنت کی آئینہ دار ہو اور حیاتِ عنصری کے جملہ ظاہری اور باطنی پہلوؤں میں فطرتِ صحیحہ کی حقیقت آشکارا کرتی ہو۔ ایسی حقیقت اس سفرِ حیات میں عشقِ مقیم کے بغیر آشکارا نہیں ہو سکتی۔ اس راہ پر گامزن ہو کر سالک کو کائنات میں انسانی مقام اور الٰہی ہستی کا بچشمِ باطن ادراک ہوتا ہے۔ عنصری زندگی میں تخلیقِ انسانی کا مشن، مقاصدِ حیات اور بندگی اور زندگی کے اسرار و رموز منکشف ہوتے ہیں۔ نیز اس حقیقت سے پردہ کشائی ہوتی ہے کہ اس زندگی ظاہر کے اعتبار سے مثبت اور تعمیری حرکت و عمل اور باطن کے اعتبار سے مالکِ حقیقی کی طرف ہمہ وقتی رجوع اور مشاہدۂ حقیقت سے عبارت ہے۔ عارفین کے نزدیک حیات کے ان دونوں پہلوؤں میں سے کسی پہلو سے گریز اجتناب نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ظاہر و باطن باہم لازم و ملزوم ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ظاہر میں ہونے والے ہر اچھے بُرے عمل کے پسِ پردہ باطنی محرکات ہوتے ہیں۔ ذہن میں اچھے افکار کا سلسلہ وارد ہونے پر اچھے اعمال اور غلط تصورات کی پیداوار سے مذموم افعال سرزد ہوتے ہیں۔ حدیثِ پاک "اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ" کے مطابق اعمال کا تعلق نیت اور ارادے سے ہے۔ لیکن نیت اور ارادے کے پسِ پردہ پیدا شدہ محرکات کے پیشِ نظر ضرورت اس امر کی ہے کہ ذہنی اور روحانی طور پر ایک ایسی فکرِ اولیٰ میں محویت رکھی جائے جو تمام فکری امور پر حاوی ہو۔ فکرِ اولیٰ کا یہ زاویۂ مستقیم جملہ افکارِ حسنہ کے زاویوں کی آئینہ حال میں بنیاد ثابت ہوتا ہے کہ فکرِ اولیٰ میں محویت کے نتیجہ میں سالک کے ذہن

میں پیدا ہونے والے جملہ خیالات و افکار کا عمل کشید جاری ہو جاتا ہے۔ خیالات فاسدہ اور اوہام باطلہ فنا پذیر ہوتے جاتے ہیں اور نسبتاً اچھے افکار اِس طریقِ کشید و تطہیر سے نمودِ نو حاصل کرنے کے بعد راستی پذیر ہوتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ عقلِ سلیم عشقِ مقیم سے خوشہ چینی کرتی ہے، اور علمِ عرفان سے۔

فکرِ اولیٰ باری تعالیٰ کی صفاتی شان میں فکر کا نام ہے۔ فرمانِ نبویؐ "تَفَكَّرُوا فِي صِفَاتِهِ" کے مطابق ربِ کائنات کی صفاتی شان میں تفکر لازم ہے۔ انسان زبدۃ الکائنات، عالمِ اصغر اور خلیفۃ اللہ فی الارض ہے، جس کی تخلیق "احسن تقویم" میں ہوئی۔ کائنات میں شانِ باری تعالیٰ کی تخلیقی اور ربّانی صفات کی مشاہدہ بینی کرنے والوں کی نگاہِ فکر انسانی شبیہہ پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ اور اس شبیہہ کی ارتقائی نورانی تجلیات میں باطنی طور پر بتدریج جذب ہو کر فکرِ اولیٰ میں ہر آن بہتر نکھار پیدا کرتے ہوتے عرفانِ حقیقت سے بہرہ ور ہوتی ہے۔ یہ شبیہہ مقاصدِ قرآن و سنت کے نگہبان شیخِ کامل کی شبیہہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حصولِ عرفان کے نقطۂ نظر سے راہِ سلوک میں تصورِ شیخ کیا جاتا ہے۔ مرشدِ پاک کا تصور فکرِ اولیٰ کا خصوصی ورود ہے۔ اس فکر کے ساتھ ذکر کا تسلسل قائم رہنا نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ ذکر و فکر باہم لازم و ملزوم ہیں۔

راہ سلوک اور تعمیر احساس

راہِ سلوک میں ہمہ وقتی ذکر و فکر میں جہد کے ساتھ ساتھ ایک بہت بڑی بنیادی ضرورت تعمیرِ احساس کی ہے۔ یہ بجا ہے کہ ذکر و فکر سے احساسات فطری طور پر درست زاویوں پر گامزن ہوتے ہیں، اور تزکیۂ نفس اور تصفیۂ قلب بھی حاصل ہوتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود سالک کے لئے تعمیرِ احساس کے تصور اور اس میں باقاعدہ جہد سے آگہی لازم ہے۔ کیونکہ اگر احساسات متزلزل ہو جائیں تو حصولِ عرفان کے نقطۂ نظر

سے بڑی سے بڑی عبادت بھی بے مقصود ثابت ہوتی ہے۔ تعمیرِ احساس کا اصول اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ فکر و عمل میں حق کا باطل کے ساتھ قطعی التباس نہ ہو۔ جملہ منفی خیالات و احساسات، لایعنی تصورات، منفی جذبات اور اوہامِ باطلہ آن کی آن میں نیست ہوتے جائیں۔ سالک کا قدم بمنزلِ اثبات رواں دواں ہو، اور خالص آنِ انسانی اجاگر ہوتی جائے۔ تعمیرِ احساس عرفانِ معنوی ہے، اور جس قدر کوئی سالک اس جہد میں کامیاب ہو اسی قدر سفرِ سلوک میں باطنی کامرانی سے ہمکنار ہوتا ہے۔ عارفین کے نزدیک تعمیرِ احساس میں جہد کا پہلو نامعقول طالب کو معقول جاہل کو خود آگاہ، غیر ذمہ دار کو صاحبِ رعیت، بے کار کو مصروف اور مصروف کو قانع بناتا ہے۔ غریب کو غیور و دیانت دار، امیر کو دریا دل، حاکم کو خادمِ خلق، صاحبِ اختیار کو رحمدل، ثالث کو عدل پرور اور مجبور کو مجاہد ہونے کا درس دیتا ہے۔ مظلوم کو اجتماعی معاشرتی ظلم کے خلاف جہاد کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ نیز اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ مجاہدہ محض ذکر و فکر کا ہی نام نہیں بلکہ یہ مع ذکر و فکر حیاتِ عنصری کے ہر سمت فکر و عمل سے عبارت ہے۔ لہٰذا طالبِ حق سالک کے لئے مجاہدہ کی ایسی منہج پر گامزن ہونا لازم ہے جس میں ہر سوچ اور عمل ذکر و فکر کا ضمیمہ ہو۔ اس طریقِ فکر سے کیا جانے والا مجاہدہ سلوک کی صحیح صراطِ مستقیم ہے جس پر عمل پیرا ہونے سے گوہرِ مقصود قدرتی طور پر قریب تر ہوتا جاتا ہے۔ بقولہٖ تعالیٰ۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ (العنکبوت ۶۹)

تعمیرِ احساس کا حسی ارتقا اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ سالک کے ذہن میں تنگ دلی، کنجوسی، دنیاوی متاع کی لالچ اور حرص و ہوس کا تصور قطعی طور پر معدوم ہو جائے۔ اور اس کی بجائے فراخدلی، سادگی، کفایت شعاری، فضولیات سے

اجتناب اور قناعت کے اتفاقی تصورات کا ورود ہو۔ ذہن کی لغات میں "خواہش" کا لفظ باطنی طور پر قطعی مہمل ہو جائے۔ اچانک پیدا ہونے والے مذموم خیالات جو مابعد نفسانی اور شیطانی خواہشات کا پیش خیمہ ثابت ہونے والے ہوں "لا" کی تلوار سے نیست ہوتے جائیں۔ "انسانی خواہشات" کا مفہوم، مقاصدِ اولیٰ کی تکمیل اور دردِ دل کی پاسداری میں ضم ہو جائے۔ اور غلط فہمی کی بنا پر ذہن میں لفظ "خواہش" سے منسوب ہونے والے بعض معاملات فرائض کی بجا آوری اور فطری حاجات کی تکمیل کے مشن سے منسلک ہو جائیں۔ علمی ہمہ دانیوں کا چراغ مرشد پاک کے چراغِ معرفت کے سامنے قطعی ماند پڑ جائے۔ نسلی تفاخر حسبی نسبی برتری اور "پدرم سلطان بود" کے خمار آلود احساسات "خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ" (النساء ۱) کی حقیقت کے سامنے از خود بے حقیقت ہو کر معدوم ہو جائیں۔ نیز نفس کے تاریک تہہ خانوں میں اس کی منافقانہ چالوں اور شاطرانہ ترکیبوں سے تعمیر ہونے والی مسجدِ ضرار مسمار ہو جائے۔ تابانیٔ احساس کے نتیجہ میں اس حقیقت کا نورِ بصیرت حاصل ہوتا ہے کہ راہِ سلوک میں دیدہ دانستہ ترکِ فرائض اور ذمہ داریوں سے پہلو تہی کر کے مراقبوں میں بیٹھے رہنا بے حضوری کا رش اور بے مقصود طرزِ عمل ہے۔ اکتسابِ عرفان کے لئے مراقبہ نہایت ضروری ہے لیکن فرض عبادت کے علاوہ خصوصی عبادات کے لئے مراقبوں میں اہتماماً بیٹھنے کا معمول شب و روز میں فطری طور پر ملنے والے لمحاتِ فراغت سے ہے۔ بقولہٖ تعالیٰ۔

فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ ۝ (الم نشرح ۷)

تعمیرِ احساس سے فکری اور عملی آگاہی کے نتیجہ میں اہلِ طلب تجاہلِ عاشقانہ سے گزر کر سلوک و عرفان کی نکھری ہوئی راہ پر گامزن ہوتے ہیں۔ پھر مرشد پاک کے طفیل عشقِ حقیقی نئے رنگ میں نمودار ہوتے ہوئے تسخیرِ حواس کا تقاضا بیدار کرتا ہے اور مرشد پاک کا مشن اس امر کا متقاضی ہوتا ہے کہ حواسِ خمسہ کا باطنی کردار فطرتِ صحیحہ کے تابع ہو جائے۔ دیدنی شنیدنی، کردنی، گفتنی اور خوردنی امور میں سالک پر آنِ حق کی نگہبانی مسلط ہو جائے۔ نیز

جملہ فکری اُمور میں "یُدَبِّرُ الاَمرَ" کا ظلّی تاثر ہو۔ ذکرِ مسلسل میں اُلوہیت تصورِ شیخ اس کٹھن ترین مجاہدہ میں معاون ثابت ہوتا ہے

راہِ سلوک اور دینِ فطرت کی اذانِ حق نما

دینِ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات اور صحیح دینِ فطرت ہے جس میں زندگی کے تمام پہلوؤں کے متعلق واضح ہدایات ملتی ہیں۔ عقلِ سلیم اور سائنسی علوم اس کے پیش کردہ نکات کی توثیق کرتے ہوئے اس کے ربّانی انسائیکلوپیڈیا سے خوشہ چینی کرتے ہیں۔ رُوئے زمین پر انسانی طرزِ معاشرت کے جملہ فارمولے "فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ" [البقرہ ۲۳] کا چیلنج قبول نہیں کر سکتے۔ مقاصدِ حیات کی تعبیر کرنے والے فلسفیانہ مفروضے، منطقی دلائل کے وکالت نامے اور انسانی تاریخِ حیات کے جملہ صحیفے اس بے مثال اور ہمہ گیری نظام کا نعم البدل پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ کیونکہ یہ احکامِ الٰہی کا انسانی ضابطۂ حیات ہے جس میں کوئی نقص وخم یا کجی نہیں۔ زمینی زندگی بسر کرنے والے جملہ انسانوں کے لئے خدا سے واحد کا پیش کردہ یہ ضابطۂ حیات، عاشقانہ حکیمانہ اور عارفانہ نقطۂ خیال سے بھی ہر لحاظ سے مکمل ہے اور حیاتِ انسانی کی ہمہ جہتی اور فطری شرح پیش کرتا ہے۔ سلوک وعرفان کی راہ اسلامی ضابطۂ حیات کی جان ہے۔ سلوکِ اسلامیہ کی صراطِ مستقیم پہ گامزن ہونے سے طالب ومطلوب میں قدرتی طور پر باہمی مقناطیسی کشش پیدا ہوتی ہے "فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ" [البقرہ ۱۵۲] کی صداقت آئینۂ حال میں عیاں ہوتی ہے اور گوہرِ مقصود قریب تر ہوتا جاتا ہے۔

اسلامی طریقت اِس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ سالک اپنی حیاتِ عنصری کو مقاصدِ فطرت کی تکمیل کے لئے ہمہ تن موقوف قرار دے، ہر لمحہ اپنی آن کے مطابق ہر ایسی واجبی عبادت کا مظہر ہو جس کا فی الوقت فطرتِ صحیحہ تقاضا کرے

ہو کیونکہ راہِ سلوک میں تضیعِ اوقات کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس لحاظ سے سالک کو مثبت اور تعمیری، اصلاحی اور فلاحی، شرعی اور روحی، بدنی اور عضویاتی، قولی اور فعلی نیز قلبی اور روحی یعنی ہر نوع کی عبادت سرانجام دینے کی تلقین ہے۔ اس عین فطری طرزِ حیات کی اذانِ حق نما کا قرآن میں یوں بیان ہے۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ (الروم ۳۰)

"اپنا منہ سب طرف سے موڑ کر دین کی طرف کرو۔ یہ خدا کی وہ فطرت ہے جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا۔ خدا تعالیٰ کی بنائی ہوئی خلقت میں کوئی تبدیلی نہیں۔ یہی سیدھا اور ٹھیک دین ہے۔

راہِ سلوک اور موت قبل از موت

ارشادِ نبوی "مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا" کے مطابق راہِ سلوک میں موت قبل از موت سے آشنا ہونا اور آئینۂ حال میں اس کیفیت کے ردِ عمل سے مستقل طور پر آگاہ رہنا بھی لازمی امر ہے۔ موت سے پہلے موت کا تصور حیاتِ فانی کی فنا کے "بعد حیاتِ باقی" میں بقا کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے۔ آئینۂ حال میں مقام موت قبل از موت کے لئے جہد و اکتساب اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ ذہن میں پیدا ہونے والے نفسانی انانیت کے ترجمان احساسات کو "لا" کی تلوار سے ختم کیا جائے اور عیش کوشی، آرام طلبی، تن مانی اور تن آسانی کا تصور قطعی معدوم کیا جائے کیونکہ ایسا تصور نفس کے کج رو تقاضوں کی ترجمانی کرتا ہے۔ سالک کے ذہن میں یہ بنیادی تصور ہو کہ وہ اس دارالامتحان میں کسی بھی لمحہ گرفتارِ عیش نہ ہوگا۔ وقت کے لمحوں کو صحیح مصرف میں لایا جائے۔ انسانی بعثت کے مقاصد کی تکمیل

شعارِ حیات ہو۔ فکر کے کسی زاویہ میں بھی طلبِ دنیا کا نقطہ رُونما نہ ہو۔ حدیث کی رُو سے دُنیا مردار اور اس کے طالب کُتّے ہیں۔ لہٰذا مُردار سے دلچسپی قطعی ختم کی جائے اور فانی دنیا کے قبرستان کو دین کے باغات کی شجر کاری سے مزیّن کیا جائے نفس کے خیالی پلاؤ کی دعوتِ طعام قبول نہ کی جائے بلکہ خیال سے بھی آگے گزرا جائے۔ ذکر سالک کی غذا، فکر اس کا لباس اور سالک کا کام "عبدہٗ" کا زیورِ حیات ہے۔ ان تینوں چیزوں میں کسی سے بھی اجتناب اصولِ طریقت کے خلاف ہے۔ راہِ سلوک میں ضرورت اس امر کی ہے کہ دنیاوی سطح پر کی خوش بختیوں اور کامرانیوں کی خوشی اور خمار کے جذبات نفی ہوتے جائیں۔ نیز مایوسیوں، ناکامیوں اور نامرادیوں کے پُر ملال وسواس و شکوات کی بھی نفی کی جائے۔ ذہن میں پیدا ہونے والے اس عارضی مدّ و جزر کی اگر "لا" کی تلوار سے نفی نہ کی جائے تو نفس کے تقاضے فی الفور بیدار ہوتے ہیں۔ اور یہ موت آشنا نہیں رہتا۔

کلامِ ربانی ۔ "لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ (البقرہ ۲۸۴)" کی روشنی میں سالک کے ذہن میں یہ احساس قائم و دائم رہنا لازمی ہے کہ اُسے حیاتِ عنصری میں ملنے والی ہر نعمت مالک کی دین ہے۔ وہ اس نعمت کا امین ہے اور اس کا بے جا تصرف نہیں کر سکتا۔ لمحاتِ عمر بھی امانت ہیں جنہیں مشیّتِ ایزدی کے خلاف استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ سالک کو وقت کا بہترین نباض ہونا پڑتا ہے۔ وقت کے تقاضے قدم قدم پر مشیّتِ ایزدی کے مطابق مثبت اور تعمیری، اصلاحی اور فلاحی عباداتی امور کی سرانجام دہی کا پیغام دیتے ہیں اور امورِ سنّت و طریقت کی عظمت و اہمیت واضح کرتے ہیں۔ سالک کو ذکر و فکر کے ساتھ ساتھ ہر عمل مقاصدِ فطرت کی تکمیل میں کامل خود سپردگی کے ساتھ سرانجام دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ انفرادی اور اجتماعی، خانگی اور معاشرتی نیز دینی اور معاشی ذمہ داریاں انسان کے نفس کو جکڑ کر رکھ دیتی ہیں اور اس کا نفس شدید گھٹن میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

ہمہ وقتی ذکر و فکر میں جہد کے ساتھ مشیت کے موجب کارِ حیات کٹھن ترین چلہ کشی ثابت ہوتا ہے۔ اس دو طرفہ طرزِ عمل کے نتیجہ میں نفسانی انانیت بتدریج کمزور ہوکر نہایت ہی کڑے انداز سے نیست ہوجاتی ہے۔ نفس کا ہر جذبہ جان فنا پذیر ہوجاتا ہے۔ "موتوا قبل ان تموتوا" کی تفسیر آئینہ حال میں واضح ہوجاتی ہے۔ اور ہر جذبہ اپنی فنا میں حیاتِ ثانیہ کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے ؎

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را
ہر زماں از غیب جانے دیگر است

راہِ سلوک اور ریاضت و مجاہدہ

اسلامی تصوّف کی راہِ سلوک حیاتِ عنصری میں ظاہری اور باطنی جہادِ مسلسل کا تقاضا کرتی ہے۔ ظاہری جہاد کے ساتھ جملہ ظواہر طریقت وابستہ ہیں، جبکہ باطنی جہاد ہمہ وقتی ذکر و فکر، تزکیۂ نفس اور تصفیۂ قلب پر موقوف ہے۔ مقاصدِ قرآن و سنّت کا جس قدر گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے سالک پر اسی نسبت سے اسلامی طرزِ ریاضت و مجاہدہ کی افضلیت منکشف ہوتی ہے۔ سالک آئینہ حال میں اس حقیقت کا راز آشنا ہوجاتا ہے کہ دینِ اکمل کے پیش کردہ فطری ضابطۂ حیات میں کیا جانے والا مجاہدہ حقائق آشنائی اور معرفتِ خداوندی کا وسیع ترین دائرہ کار پیش کرتا ہے۔ فطرتِ صحیحہ کے اصولوں کی ترجمان زندگی بلاشبہ کٹھن ترین ریاضت ہے جس میں صبر و قناعت پر بھی قائم رہنا پڑتا ہے اور مثبت حرکت و عمل جاری رکھتے ہوئے بازمانہ ستیز بھی ہونا پڑتا ہے۔ آنِ انسانی کی پاسداری بھی لازم ہے اور تذلیلِ نفس بھی۔ نیز مثبت کارِ حیات کی سرانجام دہی کے لئے نفس کے ساتھ عادل بھی ہونا پڑتا ہے۔ اور اس کی کج فطری نیست کرنے کے لئے اس پر قاہر بھی۔ نفس کو عدل اور قہر ہر دو صورتوں میں اپنی موت دکھائی دیتی ہے۔ اس لحاظ سے عدل قہر کے موجب ہے اور اس پر قہر اس کے ساتھ عدل

ہے۔ اہلِ سلوک کو مشیت کے اتباع میں رہنے کا معمول اپنانا پڑتا ہے۔ اور غلطی کرنے کا تصور ختم کرنا ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ باطنی صفائی کا بنیادی نکتہ ہے۔

کارِ حیات کی مثبت اور متصادم مصروفیات، عائد شدہ ذمہ داروں کی انجام دہی، نیز دینی اور دنیاوی فرائض کی بجا آوری ایسے عوامل ہیں جن کے ذریعے مجاہدہ ارتقائی مراحل میں داخل ہوتا ہے۔ صحیح ریاضت و مجاہدہ کے انجام پذیر ہونے میں ضرورت اس امر کی ہے کہ سالک کی طرف سے جملہ عباداتی اُمور کی انجام دہی کے سبب نفسِ انسانی شدید گھٹن کا شکار ہو جائے۔ نفس پر یہ احساس غالب ہو جائے کہ اس کے لئے کوئی راحت اور سامانِ عیش نہیں۔ نفس کی دنیا اُمید پر قائم ہے۔ اس اُمید میں بڑے بڑے خیالی پلاؤ پکتے ہیں۔ اور قسم قسم کے سبز باغ دکھائی دیتے ہیں۔ نفسانی انانیت کے خماریات، خواہش آفرین جذبات اور دلفریب حسرتوں کے سوز ریاد سواس ابھرتے ہیں۔ اہلِ سلوک کو ایسی اُمیدیں ختم کرنا پڑتی ہیں اور ذکرِ "لا اِلٰہ" میں ہر نفسانی وسوسہ اور جذبہ کی نفی کرتے ہوئے ذکرِ "اِلّا اللہ" میں توکل علی اللہ پر قائم رہنا ہوتا ہے۔ یہی "لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللہِ" کا اصل مفہوم ہے۔ ہمہ وقتی ذکر و فکر میں جہد کے ساتھ ساتھ مثبت کاروبارِ حیات میں بے آرامی، وقت کی صحیح قدر شناسی، عباداتی امور کی انجام دہی، سفر سے مسلسل گریز اور کسبِ حلال کے نتیجہ میں نفس میں پیدا ہونے والی بدنی تکلیف، ریاضت و مجاہدہ کے خاص پہلو ہیں۔ سالک کو دردِ دل، دردِ بدن اور دردِ سر کی کیفیات میں مبتلا رہتے ہوئے کٹھن تکلیف سے آشنا ہونا پڑتا ہے۔ حدیثِ پاک کی رُو سے یہ دنیا کافر کے لئے جنت اور مومن کے لئے قید خانہ ہے۔ لہٰذا اہلِ سلوک کے لئے ریاضت و مجاہدہ میں ہمہ پا درد آشنا ہونا لازمی ہے۔ اس درد آگاہی کے نتیجہ میں صحیح قلبی سوز کی نعمت میسر ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں روحانی اور "خالص انسانی" اقدار کا ہمہ وقت نفس پر حاوی

ہونا کٹھن ترین اور صبر آزما چلہ ہے۔ جب نفس کو اپنی فطرت دائگوں پر زندہ رہنے کے لئے کوئی غذا میسر نہیں آتی تو اس کی تمام اُمیدیں خاک میں مل جاتی ہیں۔ اس کے افکار کی دنیا اُجڑ جاتی ہے۔ نتیجتہً یہ موت سے پہلے ہی موت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور سالک کی حیات ثانیہ کا آغاز ہوتا ہے۔

بے تکے مجاہدات، ذمہ داریوں سے فرار اور فرائض انسانیہ سے پہلوتہی کے عمل سے اسلامی تصوف کی روح کی فعالیت کو ضعف پہنچتا ہے۔ رہبانی مجذوبیت سے انسانی بعثت کا مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ ذکر و فکر کی لذّت جملہ دنیاوی لذات کی قاطع ہے۔ اسلامی تصوّف کی راہِ سلوک اس امر کا تقاضا نہیں کرتی کہ سالک کسی لذّت کا شکار ہو کر عملی عبادت سے محروم ہو جائے۔ خواہ یہ لذّتِ ذکری کیوں نہ ہو۔ اکثر مجذوب حضرات کا مجاہدہ انہیں اس نہج پر لا ڈالتا ہے کہ وہ عموماً تمام دنیاوی لذات سے بے نیاز ہو جانے کے باوجود عموماً بے خیالی کے طور پر لذتِ ذکر و فکر میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ جبکہ سالک ذکر کی لذت سے آشنا ہونے کے باوجود اس میں گرفتار نہیں ہوتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ذکر و فکر سے حاصل ہونے والی لذّت ایک قدرتی عطیہ ہے لیکن اس کا گرویدہ ہو کر اس میں اُلجھ کر رہ جانا کسی طور سے بھی مناسب حال نہیں کیونکہ انبساطِ دل مقام پر جمود طاری کر دیتا ہے۔ جملہ دنیاوی لذّات کو خیر باد کہنے کے بعد انجام کار بھی ایک بہت بڑی لذّت میں گرفتار ہو جانا، اور اعضائے جسمانی اور عقلِ انسانی پر لاگو ہونے والی عبادت کو معطل کر بیٹھنا مجاہدہ میں نقص کا واضح پہلو ہے جس کی پیش بینی مراحلِ سلوک کے لئے لازمی ہے۔

مقصدِ تخلیقِ انسان

عارفین کی نگاہ میں انسان کی حیاتِ عنصری کے دو بڑے پہلو ہیں۔ مجاہدہ اور مشاہدہ۔ ان دونوں پہلوؤں میں عبادت کا مفہوم کلی طور پر مضمر ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ عبادت کے مفہوم کو مکمل طور پر ذہن نشین کیا جائے۔ اس لئے کہ "عبد" عبادت سے عبارت ہے اور قرآنِ حکیم کی روشنی میں تخلیقِ انسان کا مقصد محض عبادت ہی بیان کیا گیا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝ (الذّٰریٰت ۵۶)

ترجمہ:- میں نے جنوں اور انسانوں کو محض اس لئے پیدا کیا کہ وہ عبادت کریں۔

مذکورہ آیتِ کریمہ میں عبادت کا اس قدر وسیع اور ہمہ گیر مفہوم پیش کیا گیا ہے کہ انسان کی حیاتِ عنصری کا ایک ایک لمحہ اس کی لپیٹ میں آجاتا ہے۔ لہٰذا حیاتِ عنصری اصلاً محورِ عبادت اور محض عبادت ہی ہے۔

عبادت کا ہمہ جہتی مفہوم

دینِ فطرت کی روشنی میں عبادت کے مفہوم کو کسی طور سے بھی محدود اور تنگ تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔ اسلامی طریقت کی رُو سے سالک یعنی سچائی کی راہ کا مسافر نسلِ انسانی اور معاشرۂ اسلامی کا ایک بڑا جاندار پرزہ ہے جس کو باری تعالیٰ کی خوشنودی اور بقائے انسانیت کے حصول کے لئے کام کرنا پڑتا ہے۔ زمینی زندگی بسر کرنے والے طالبِ حق سالک کے ساتھ قدم قدم پر گوناگوں نفسانی تقاضوں اور شیطانی مداخلتوں کا تعلق وابستہ ہوتا ہے۔ لہٰذا

نفسانی اور شیطانی قوتوں کے خلاف انفرادی اور اجتماعی سطح پر جہاد کرنا اور انہیں مسمار کرنا بھی عین عبادت کے زمرہ میں شامل ہے۔ نماز فرض عبادت ہے جس کا ادا کرنا از روئے شریعت و طریقت ہر مسلمان پر فرض ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کے مقاصد پر عمل پیرا ہونا بھی اسی طرح لازمی ہے جیسا کہ اس فرض کا ادا کرنا۔ ورنہ بموجب قرآن۔

فَوَیۡلٌ لِّلۡمُصَلِّیۡنَ ۙ الَّذِیۡنَ ہُمۡ عَنۡ صَلَاتِہِمۡ سَاہُوۡنَ ۔ (الماعون ۴-۵)

یعنی خرابی ہے ایسے نمازیوں کے لئے جو اپنی نمازوں سے غافل ہیں۔

جب تک بے حیائی، برائی اور سرکشی کے کاموں سے گریز نہ کیا جائے نماز آشنائی کا مقام حاصل نہیں ہوتا۔ مزید برآں ہر نماز کی ہر رکعت میں "اھدنا صراط المستقیم" کے الفاظ میں بارگاہِ ایزدی سے توفیق اور دعا مانگی جاتی ہے جو اس حقیقت کی پردہ کشائی کرتی ہے کہ حالتِ نماز سے علاوہ جملہ اوقات و لمحات میں "سیدھی راہ" پر چلنا بھی لازمی ہے۔ ایک ایسی سیدھی اور سچائی کی راہ جس پر اللہ تعالیٰ سے انعام یافتہ حضرات گامزن ہوئے۔

عام معمول کے مطابق دن میں پانچ نمازوں کی ادائیگی میں مجموعی طور پر کم و بیش تین گھنٹے صرف ہو سکتے ہیں۔ اگر بالفرض عبادت کا مفہوم پنجگانہ نماز، کچھ اضافی نوافل اور تسبیح و تقدیس وغیرہ تک ہی محدود تصور کر لیا جائے تو شب و روز کے باقی ماندہ اوقات میں بقایا کارگزاریوں کو عبادت سے خارج تصور کرنا پڑے گا۔ جبکہ یہ اندازِ فکر کلامِ ربانی۔ "وَمَا خَلَقۡتُ الۡجِنَّ وَالۡاِنۡسَ اِلَّا لِیَعۡبُدُوۡنِ" کے مفہوم کی نفی کرتا ہے لہٰذا عبادت کا مفہوم ہماری عنصری زندگی کے جملہ پہلوؤں پر محیط ہے۔

عبادت کے جامع مفہوم اور اس کے ہمہ گیر اندازِ فکر کے اعتبار سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ سالکانہ عنصری زندگی میں انسان کے خورد و نوش نشست و برخاست، سفر و حضر، نقل و حرکت، قماش و معاش، تہذیب و ثقافت

تعلیم و تدریس، افکار و اطوار، قول و فعل، افہام و تفہیم اور نظریہ سیاست و معاشرت نیز خانگی اور ازدواجی معاملات حتیٰ کہ اس کی پرائیویٹ زندگی کے معمولی سے معمولی معاملہ میں بھی عبادت کا پہلو بدرجۂ اتم موجود ہونا لازمی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر فکر و عمل پر عبادت کا فرضی عکس ڈال کر جاہلانہ اطمینان حاصل کر لیا جائے بلکہ اس مقصدِ عظیم کی تحصیل و تکمیل کے لئے سالک کو حق کے ساتھ باطل کا التباس قطعی طور پر ختم کرنے کے لئے جہدِ مسلسل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور ہر معاملہ میں عبادت کا فکری اور عملی مفہوم پیشِ نظر رکھنا پڑتا ہے۔ اس لئے کہ عبادت زندگی کے تمام پہلوؤں اور اوقات پر محیط ہے۔

چند فطری امورِ حیات

ہمہ جہتی عبادت کے ہمہ گیر اندازِ فکر کو مزید اجاگر کرنے کے لئے یہاں چند ایسے فطری امور پر تبصرہ کرنا ضروری ہے جن سے عہدہ برآ ہوتے ہیں نگاہِ عامہ کو عبادت کا مفہوم معدوم یا دھندلا دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً رفعِ حاجت ہی کا معاملہ ملاحظہ ہو جو ابنِ آدم کے لئے ایک فطری مجبوری ہے۔ اگر سالک رفعِ حاجت اس خیال سے کرے کہ وہ ایک فطری تقاضے کے مطابق اپنے جسم کا بوجھ ہلکا کر رہا ہے تاکہ وہ بعد ازاں دوبارہ طہارت حاصل کر کے مالکِ حقیقی کے منشا کی تکمیل میں روز مرّہ کے امورِ حیات سرانجام دے سکے تو ایسی صورت میں اس فطری امر کی تعمیل عبادت ہوگی کیونکہ عمل کا تعلق نیّت سے ہے۔

دوسرا معاملہ ازدواجی مباشرت کا ہے جس کی بالمعروف انجام دہی میں بھی مقاصدِ فطرت کی تکمیل کا احساس قائم رکھنا ضروری ہے۔ نیز یہ کہ حدیثِ پاک میں نکاح نصف الایمان قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا فطرتِ صحیحہ کے رواں دواں تقاضوں اور رشتۂ ازدواج کی دینی متانت کے پیشِ نظر ازدواجی مباشرت کا عمل بھی عباداتی امور میں سے ہے۔

فطری معاملاتِ حیات میں عبادت کے پہلو کا بظاہر دھندلا عکس ظاہر کرنے والا تیسرا معاملہ مناسب خورد و نوش سے وابستہ ہے۔ مناسب خورد و نوش کا تعلق صحت و حیات کے قیام و بقا سے ہے اور صحت و حیات کے قیام و بقا کا مطمحِ نظر عالمِ عنصری میں تندرستی اور طویل عمر کا سرور حاصل کرنا ہرگز نہیں بلکہ مشیتِ الٰہیہ کا اتباع و نفاذ ہے۔ مشیت کے مطابق جملہ فطری امور اور انسانی فرائض کی بجا آوری کے لئے مناسب توانائی حاصل کرنے کی غرض سے مناسب خورد و نوش لازم ہے۔

"قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ ط" (الاعراف ۳۲)

اے نبی پاک کہہ دیجئے کہ کس نے اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ زینتوں کو حرام قرار دیا جو اس نے اپنے بندوں کے لئے پاکیزہ چیزوں سے نکالیں۔

ایسی صورتِ حال میں جبکہ حلال اور پاکیزہ غذا کھانے کا اصل مقصود صرف مالکِ حقیقی کے مشن کی تکمیل کے لئے صحت و توانائی کا حصول ہو اور جسمانی توانائی کا مصرف کما حقہٗ درست ہو تو خورد و نوش کا معاملہ بھی عباداتی امور میں شامل ہوگا۔ یہاں اس امر کی وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ عارفین کے نزدیک اصلاً صحیح اہلِ سلوک حضرات غذا کے استعمال سے قبل اس کی خیالی لذت کے خمار کا اثر قبول نہیں کرتے۔ نیز دورانِ استعمال اس کی مادی لذت کے خمار اور بعد از استعمال اس کی اثراتی لذت کے خمار کی نفی کرتے ہیں۔ اس لئے کہ حقیقت و معرفت کی رو سے اشیائے خوردنی کے تصرف میں لذت کے پہلو سے ملنے والے خمار کی فوری نفی لازم ہے۔ اس تحقیقی نکتہ کا حال وارد ہونے پر سالکین کی نگاہ میں ایک مقام پر حلوہ اور دال ایک جیسے ہو جاتے ہیں۔ دوسری جانب یہ عام تجربہ باقی معاملہ بھی پیشِ نظر ہو کہ لذیذ و مرغن غذا خوری کی صورت میں لاشعوری طور پر خمار حاصل ہوتا ہے۔ لہٰذا اصولِ طریقت کو مدِنظر رکھتے ہوئے اگر تھوڑی اور سادہ غذا استعمال کی جائے تو اس مرض کا کافی حد تک قدرتاً اور فطرتاً علاج ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں بعض

صوفیا اور فقراء حضرات راہِ سلوک میں روایتی فاقہ کشی کا معمول اپناتے ہیں اور نہایت تھوڑی روکھی سوکھی اور سادہ غذا کا استعمال کرتے ہیں۔ اس کی اصل اور بنیادی وجہ یہی ہے کہ خورد و نوش کے اس طرزِ عمل سے نفسانی خمار نہیں پنپ سکتا۔ لیکن مجاہدہ کا یہ طریق کار وہی حضرات اپناتے ہیں جو دماغی اور جسمانی عباداتی امور سے تقریباً سبکدوش ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ عبادت کے ہمہ جہتی پہلوؤں میں رہنے والا خلا اسی طریقہ سے پُر کرتے ہیں۔ مگر جن سالکین کی زندگی اطاعتِ خداوندی اور ہمہ جہتی عباداتی امور میں سراپا عمل ہو اور اُن پر جسمانی اور دماغی فرائض کا بوجھ اعتدال سے کہیں زیادہ ہو وہ فاقہ کشی کی بجائے خورد و نوش میں اعتدال یا اعتدال سے قدرے کم کھانے کا معمول اپناتے ہیں اور نفسانی خمار کی نفی میں جہد برقرار رکھتے ہیں۔

عبادت کے ہمہ وقتی نقطۂ نظر کی مزید توضیح کے سلسلے میں چوتھا معاملہ رات کو مناسب آرام اور نیند کا ہے۔ ظاہر ہے کہ احکامِ ربانی کی دن بھر تعمیل میں نڈھال ہو جانے والے سالکین کو اگر رات کو مناسب آرام میسر نہ ہو تو اُن کی صحت جواب دے جائیگی۔ اور وہ نتیجتاً فرائضِ انسانیہ کی کماحقہٗ انجام دہی میں رکاوٹ کی حد تک دقت محسوس کریں گے۔ سالک کو مالک کے کام کے لئے ہی جاگنا سونا پڑتا ہے۔ شب بیداری کی وجہ سے جسمانی توانائی بحال نہ ہونے کی صورت میں عباداتی امور میں خلل پیدا ہونا بالکل امکانی امر ہے۔ لہٰذا مصروفِ عمل سالکین کے لئے رات کو مناسب آرام اور نیند بے مقصد نہیں بلکہ یہ مابعد انجام پذیر ہونے والے عباداتی امور کا پیش خیمہ ہے۔ مزید برآں اہلِ سلوک کو عبادات کے ہمہ جہتی تقاضوں کی تکمیل کے لئے ذکر پاسِ انفاس میں محو رہنا ہوتا ہے جو ہمہ وقتی ذکر ہے اور مرشد کے تصور میں سانس کی آمد و رفت کے ساتھ جاری رکھا جاتا ہے۔ طریقت و معرفت کے اصول کے مطابق سوتے وقت ذکر پاسِ انفاس میں زیادہ محویت اختیار کی جاتی ہے۔ اور مرشد کے تصور میں دائیں ہاتھ کی ہتھیلی سر کے نیچے رکھ کر اور دائیں کروٹ پر لیٹ کر اس طرح سویا جاتا ہے کہ اٹھتے

جسمانی کے زاویے لفظ "محمد" کی شکل اختیار کرلیں۔ اس طرح سے ہونے والا ذکر سانس کی آمد ورفت کے ساتھ نیند کی حالت میں بھی جاری رہتا ہے۔ اور ایسی حالتِ خواب و آرام عین عبادت کی حالت میں شامل ہوتی ہے۔ باری تعالےٰ کو اسطرح سونے والے کا اندازِ خفتن بے شمار جاگنے والوں سے کہیں زیادہ پسند ہے سے

جاگنے والے کو محروم دو عالم رکھا
سونے والے سے کہا ساری خدائی تیری

مشاہدہٴ حقیقت

عارفین کی نظر میں حیاتِ عنصری کا دوسرا پہلو مشاہدہٴ حقیقت بھی عبادت ہے۔ مشاہدہٴ حقیقت سے مراد یہ ہے کہ ابن آدم اپنی ذات سمیت عنصری کائنات کے مطالعہ سے اس محیطِ کل ہستی کا ادراک حاصل کرے جو پوری کائنات میں جاری وساری ہے۔ اَللّٰہُ نُورُ السَّمٰوٰتِ وَالاَرضِ ط (النور ۳۵)۔ عقیدہٴ توحید کی حقانیت کے سلسلہ میں قرآنِ پاک میں متعدد جگہوں پر مظاہرِ فطرت کے مطالعہ کی تلقین کی گئی ہے۔ ایک طالبِ حق اور حقیقت کا متلاشی انسان جب کائناتی کتاب کے اوراق کی مشاہدہ بینی کرتا ہے تو ایک مقام پر پہنچ کر اس کی نگاہ جم جاتی ہے۔ یہ اس کی اپنی ذات کا باب ہے جس میں کائناتی کتاب کا مکمل نچوڑ موجود ہے۔ انسان قدرتِ کاملہ کا بہترین شاہکار اور عالمِ اصغر ہے۔ لہٰذا سالک کو اپنے وجود میں حقیقتِ واحدہ کا مشاہدہ کرنے کی ترغیب ملتی ہے۔ بموجب کلامِ ربانی۔ "وَفِی اَنفُسِکُم اَفَلَا تُبصِرُونَ" (الذّٰریٰت ۲۱) علاوہ ازیں فرمانِ حضرت علیؓ — "مَن عَرَفَ نَفسَہٗ فَقَد عَرَفَ رَبَّہٗ" بھی اس امر کی دلالت کرتا ہے کہ نفس کی پہچان سے رب کی پہچان ہوتی ہے۔ تخلیقِ کائنات و مخلوقات سے قبل باری تعالیٰ کا نور، نورِ احدیت کی آن میں تھا۔ اس کنزاً مخفیاً نے چاہا کہ پہچانا جائے چنانچہ مخلوقات اور کائنات کی تخلیق عمل میں آئی۔ لہٰذا مشاہدہٴ حقیقت بھی جس کا اصل تعلق عرفانِ الٰہیہ سے وابستہ ہے تخلیق

انسان کا مقصد ہے۔ انواع و اقسام کی مخلوقاتِ خداوندی میں حضرت انسان اشرف ہونے کی حیثیت سے ایسی تمام تر باطنی صلاحیتوں کا حامل ہے جو اسے باری تعالیٰ کے عرفان سے ہمکنار اور مشرف کر سکتی ہوں۔ لہٰذا معرفتِ خداوندی مقصودِ رحمان بھی ہے اور مقصودِ انسان بھی۔

یہاں یہ نکتہ واضح کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ مجاہدہ اور مشاہدہ راہ سلوک کی گاڑی کے دو پہیوں کی مانند ہیں اور فی الحقیقت ایک دوسرے کو تقویت دیتے ہیں۔ مجاہدہ مشاہدہ کے لئے راہ ہموار کرتا ہے اور مشاہدہ فطرتِ کاملہ کے اُن بصیرت افروز اسرار و رموز سے آشنا کرتا ہے جن سے حاصل ہونے والے رہنما اصولوں پر عمل کے نتیجہ میں زمینی زندگی کے اصلاحی، فلاحی اور دیگر جملہ عباداتی مقاصد کا حصول بہتر طور سے ہوتا ہے۔ نتیجتاً مجاہدہ کی طرف رغبت میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے، اور عبادت کی فطری نہج سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔

حقیقتِ بیعت

بیعت عربی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب "بیچ دینا" یا "فروخت کر دینے کا عمل" ہے۔ شریعت و طریقتِ اسلامیہ میں یہ لفظ اصطلاحاً استعمال ہوتا ہے۔ اجتماعی اعتبار سے اس سے مراد دین کے راستوں پر چلنے کے لئے مقاصدِ اولیٰ کے پیشِ نظر کسی شخص کا اپنے آپ کو کسی فردِ دیگر کے سپرد کر دینے کا عمل ہے۔ اس حال میں کہ بیعت کرنے والے فرد کو باقاعدہ مختلف ذرائع سے یقینِ کامل ہو جائے کہ اس سے بیعت لینے والا فرد دین کے راستوں پر پیش آمدہ نشیب و فراز اور پیچ و خم سے بخوبی آگاہ ہے۔ دین شناس، دین آگاہ، دین کا ترجمان و پاسبان اور دین پر قائم ہے۔ رموزِ حیات سے بہرہ ور، صاحبِ بصیرت، اور کاروبارِ حیات کا معاملہ فہم ہے۔ نیز یہ کہ اس کے قول و فعل میں کوئی تضاد نہیں۔ یہ خالص دینی فریضہ ہے اور خالصتاً فی سبیل اللہ سرانجام دیا جاتا ہے۔

بیعت کی اقسام

دینی زندگی کے جامع الامور ہونے کے اعتبار سے بیعت کے مذکورہ بالا تعارفی مفہوم

کی روشنی میں اس کی درجِ ذیل تین خاص اقسام ہیں جن میں سے ہر ایک کی اصل الاصول اپنے انفرادی زاویۂ کار کے لحاظ سے خدا اور اس کے رسول کی اطاعت ہے۔

۱۔ مملکتِ اسلامیہ میں انتخابِ خلیفہ یا عہدِ وفاداری کیلئے بیعت

اُمتِ محمدیہ میں مسلمانوں کی معاشرتی، معاشی، تہذیبی، ثقافتی دینی اور سیاسی وحدت کو برقرار رکھنے اور اسلامی اقدارِ حیات کو فروغ دینے کیلئے ریاست کا وجود لازم ہے تاکہ سرزمینِ حق پر انسانی زندگی کے جملہ پہلوؤں پر محیط شجرِ اسلام کی شاخیں مقاصدِ فطرت کے مطابق پنپ سکیں اور مسلمانوں کے ملی استحکام کو خطرات سے پاک رکھنے کے علاوہ بہتر سے بہتر بنایا جائے۔ اس مقصدِ عظیم کے حصول کیلئے اسلامی ریاست میں مسلمانوں کی طرف سے خلیفہ کا انتخاب اور تعین لازمی ہے تاکہ وہ قرآن وحدیث کے زیرِ اتباع خداوند تعالیٰ کی مشیت اور اُس کے قانون کا نفاذ کرے۔ تاریخِ اسلام میں خلفائے راشدین کے طرزِ انتخاب کی مثالیں بلاشبہ اتباعِ حدیثِ نبوی کی عکاس ہیں۔ ہر ایک کے انتخاب اور تعین کے موقع پر دیگر صحابہ کرام نے اُن سے باقاعدہ بیعت کی۔ خلافتِ راشدہ کے دور میں انتخابِ خلیفہ کیلئے اس طرز کی بیعت متاخرین عامۃ المسلمین کیلئے نمونۂ تقلید ہے۔ تاکہ وہ ایک ہی پلیٹ فارم پر ایک ہی امیر کے زیرِ قیادت اسلامی شانِ وحدت کے ساتھ کاروبارِ حیات انجام دیتے رہیں۔ لیکن اس بیعت کا مقصود خلافتِ اسلامیہ کے انتظامی اور استحکامی امور کی سرانجام دہی سے ہے۔ اس کی حیثیت روحانی اور اکتسابِ عرفان کی بیعت سے جداگانہ ہے۔ اسلامی طرزِ جمہوریت کے اصولوں کے مطابق بحیثیت خلیفہ یا امیر منتخب ہونے والا شخص عامۃ المسلمین سے بیعت لے کر انہیں باطنی طور پر وصال وعرفان کی منازل طے نہیں کراتا۔ اسلامی ریاست میں انتخابِ خلیفہ کے لئے دیگر مسلمانوں کی طرف سے کی جانے والی بیعت دراصل وفاداری اور اطاعت کا ایک عہد ہے جس میں خلیفہ کی اطاعت قرآن وحدیث کی رُو سے واجب لیکن مشروط طور پر ہے۔ یعنی جتنی دیر تک خلیفہ خدا اور اس کے رسول کے احکامات کے زیرِ اتباع

امورِ خلافت سرانجام دیتا رہے اس کی اطاعت واجب اور ضروری ہے۔ لیکن اگر وہ کوئی خلافِ دین حکم صادر کرے تو اس کی اطاعت ضروری نہیں۔ کیونکہ ایسی صورت میں خلافتی بیعت کا مقصد حل نہیں ہوتا۔

بیعت کی مذکورہ قسم کے تتبع میں اس کی ایک شاخ وہ بیعت بھی ہے جو خلافت راشدہ کے زمانہ میں سپہ سالار حضرات اسلامی جہاد میں دشمن سے مقابلہ کے لئے روانگی سے قبل اپنے زیرِ کمان لشکر سے لیا کرتے تھے۔ یہ طرزِ بیعت بھی عہد اطاعت و وفاداری کی تجدید کیلئے اپنایا جاتا تھا۔

۲۔ اکتسابِ علومِ شریعت اور اتباعِ سنّت کیلئے بیعت

اس بیعت کا تعلق تفقہ فی الدین اور اتباعِ شریعت و سنّت سے ہے اکثر علمائے ظواہر نے علومِ شریعت کے اکتساب کیلئے اپنے عظیم اساتذہ سے بیعت کی۔ اب تک بھی یہ طرزِ عمل کئی علماء حضرات کے حلقہ ہائے درس میں مروّج ہے۔ فارغ التحصیل حضرات کی باقاعدہ رسمِ دستار بندی ادا کی جاتی ہے۔ اور وہ اپنی مابعد عملی زندگی میں ابلاغِ علم اور تبلیغِ دین کا فریضہ اکثر و بیشتر اپنے استاد علماء حضرات کے مکتبِ فکر کے مطابق سرانجام دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں کئی علماء حضرات اپنے معتقدین سے اتباعِ شریعت و سنّت کے لئے بھی بیعت لیتے ہیں۔

۳۔ روحانی بیعت

شیخ کامل کے دستِ حق شناس پر کی جانے والی اس بیعت کو اکتسابِ عرفان کی بیعت بھی کہا جاتا ہے۔ اس بیعت کا مقصد اولیٰ کسی اہلِ طلب کے لئے عرفانِ حقیقت کا اکتساب ہے تاکہ وہ جن حقائق کو علمی طور پر جانتا یا پڑھ سن کر مانتا ہے، اُسے ان کی پہچان ہو سکے۔ ارشادِ ربانی ہے۔

وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ (الحجر ۹۹)

اور تو اپنے پروردگار کو یاد کر یہاں تک کہ تجھے یقین آ جائے۔

یقین کا پہلا اثباتی مرحلہ علم الیقین ہے۔ دوسرا عین الیقین اور تیسرا حق الیقین ہے۔ حق الیقین کے مرحلہ پر یقین نقطۂ کمال کو پہنچتا ہے اور شک شق ہو جاتا ہے۔ لیکن اِس آخری اثباتی مرحلہ تک جہد کے لئے کسی مردِ کامل کے ہاتھ میں ہاتھ دینا ناگزیر ہے تاکہ "یاتیك الیقین" کی صحیح ترین کیفیت وارد ہو سکے ؎

کیمیا پیدا کُن از مشتِ گِلے
بوسہ زن بر آستانِ کاملے

فرمانِ باری تعالیٰ ہے۔

یَآیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ابْتَغُوْٓا اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ وَجَاهِدُوْا فِیْ سَبِیْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (المائدہ ۳۵)

یعنی "اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اس کی طرف وسیلہ تلاش کرو اور اس کی راہ میں مجاہدہ کرو تاکہ تم فلاح پا سکو"۔

قرآن پاک کی مذکورہ آیت کے استدلال سے اللہ تعالیٰ کے راستہ میں جانے کے لئے وسیلہ کی تلاش درکار ہے اور طریقت و معرفت کی رُو سے یہ وسیلہ شیخِ کامل کا ہے۔

راہِ سلوک کا اوّلین تقاضا ہے کہ شیخِ کامل سے بیعت خالصتاً اکتسابِ عرفان کے لئے کی جائے۔ بیعت محض رسمی، مصلحتی یا کسی فکرِ غیر اللہ کا نتیجہ نہ ہو۔ طالب کو تلاشِ حقیقت میں اپنی علمی فضیلت، حسبی نسبی برتری، نسلی تفاخر، اپنی عمر کی بزرگ سالی یا دنیاوی جاہ و منصب کے تمام ستون پاش پاش کرنے پڑتے ہیں۔ اپنی اِن خصوصیات کا کسی بزرگ کی خصوصیات سے تقابلی موازنہ کرنا اور محض اس وجہ سے بیعت سے گریز کر لینا کہ طالب فلاں خصوصیات میں بزرگ سے فائق ہے شدید غلط فہمی اور جاہلانہ بدبختی کی علامت ہے۔ یہ تلاشِ حقیقت کا میزان ہرگز نہیں بلکہ بزرگی اور ولایت تقویٰ کے ظاہری و باطنی پہلو سے عبارت ہے۔ بموجب کلام

ربانی - اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰکُمْ ط (الحجرات - ۱۳) — مولانا جلال الدین
رومی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے دور کے فقید المثال عالمِ دین ہونے کے باوجود حضرت شاہ
شمس الدین تبریزیؒ کو اپنا روحانی پیشوا تسلیم کیا۔ حضرت بابا بلھے شاہؒ اور
حضرت پیر مہر علی شاہؒ ہر دو صاحبان نے خاندانِ سادات کے چشم و چراغ ہونے
کے باوجود بالترتیب حضرت بابا شاہ عنایتؒ اور حضرت خواجہ شمس الدین سیالویؒ
کے آستانہ ہائے پُرنور پر بیعت کے لئے سرِ نیاز خم کیا جبکہ موخر الذکر دونوں بزرگ
حسباً نسباً خاندانِ سادات سے نہ تھے۔ اسی طرح حضرت بابا مسعودؒ گنج شکر نے
بلحاظِ عمر مقابلتاً کہیں زیادہ معمر ہونے کے باوجود حضرت خواجہ قطب الدین بختیار
کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے دستِ حق شناس پر بیعت کی۔ علاوہ ازیں کئی بڑے بڑے
حکماء بے سروسامان قلندر صفت بزرگوں کے حلقہ ہائے ارادت میں داخل ہو کر
نورِ ہدایت و عرفان سے بہرہ ور ہوئے۔

خالص طالبِ حق شیخِ کامل کی تلاش میں اپنی اُس ہر حیثیت کی شعوری انداز میں
نفی کرتا ہے جو اُسے حیاتِ عنصری میں حسباً نسباً، وراثتاً، اکتساباً یا اپنے گرد
و پیش کے حالات کی سطح پر حاصل ہوتی ہو۔ اپنی "میں" کی نفی کی طرف
اُس کا یہ پہلا قدم ہوتا ہے۔

بیعت کا استناد و جواز اور اہمیت بیعتِ روحانی

قرآن و سنّت اور تاریخِ دین کے مطالعہ کی روشنی میں بیعت کے
استناد اور اس کے جواز سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں۔ حضور سرورِ کائناتؐ
نے خود اپنی حیاتِ طیّبہ میں حدیبیہ کے مقام پر صحابہ کرامؓ سے بیعت لی جو

بیعتِ رضوان کے نام سے مشہور ہے اور جس کی تفصیل کتب تاریخ میں موجود ہے۔ قرآنِ پاک میں اس بیعت کا ان الفاظ میں ذکر ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ ط یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ ج "اے نبی! جو لوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں وہ بیشک اللہ تعالیٰ سے بیعت کرتے ہیں۔ اُن کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ ہے۔"

گو تاریخی طور پر بیعتِ رضوان کی سُنت اُس وقت عمل میں آئی جب صحابہ کرام کو متوقع جہاد اور قربانی کے لیے تیار کیا جا رہا تھا لیکن یہ سُنت اپنے مقاصد کی آفاقی حیثیت میں مسلمانوں کے لئے ہر قسم کے داخلی اور خارجی جہاد کے لیے حلفیہ عزمِ اطاعت کی طرحدار تھی۔ ذاتی اور انفرادی قومی اور اجتماعی سطح پر اطاعت کاملہ کی نمود کا طریقہ اور ڈسپلن کا ایک فریم تھی۔ نیز نفسانی و شیطانی قوتوں کی شاطرانہ چالوں کے خلاف نبرد آزما ہونے کے لئے تجدیدِ عہدِ اطاعت کی ادب آموز تھی جس کی مقاصدی آفاقیت قائم دائم رہے گی۔

حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمہ صفت موصوف ہونے اور انسانیت کا مکمل ترین نمونہ ہونے کے اعتبار سے آپ کی بیعت انسانی زندگی کے ظاہری اور باطنی ہمہ جہتی تقاضوں کی تکمیل کرتی ہے۔ لیکن دورِ رسالت کے مابعد زمانہ میں ریاستی نظم و نسق کے لیے خلافتی بیعت اور اکتسابِ عرفان کے لئے روحانی بیعت ہر دو کی سُنت جداگانہ حیثیت میں قائم ہوئی۔ چنانچہ خلیفۃ الرسول حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خلافتِ اسلامیہ کے لئے عامۃ المسلمین سے بیعت لینے کے علاوہ کئی حضرات سے بفیضِ رسالت مآب روحانی بیعت بھی لی۔ اور باقاعدہ ایک روحانی سلسلہ کی بنیاد رکھی جو بعد ازاں سلسلہ نقشبندیہ کے نام سے مشہور ہوا۔ اسی طرح حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے بھی کئی حضرات

سے روحانی بیعت لی اور تشنگانِ عرفان کے لئے روحانی سلسلہ جاری کیا۔ آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو کر نورِ ہدایت و عرفان سے بہرہ ور ہونے والے بزرگوں میں خواجہ حسن بصری کا نام تاریخی طور پر بہت نمایاں ہے۔ عارفین اسلام اور صوفیائے عظام کے تمام روحانی سلاسلِ طریقت حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر منتہی ہوتے ہیں جن کا ریکارڈ اب بھی اکثر و بیشتر صوفیا و سالکین کے پاس موجود ہے۔ یہ روحانی شجرے اس امر کی تاریخی شہادت دیتے ہیں کہ ہر بزرگ نے کسی نہ کسی مردِ حق شناس کے دستِ ضیا پاش پر بیعت کی۔

؎ مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم
تا غلام شمس تبریزی نہ شد

مذکورہ بالا تاریخی اور دینی حقائق کی روشنی میں روحانی بیعت کے استناد اور اس کی صداقت میں کسی اشتباہ و ابہام کی دلیل باقی نہیں رہتی۔ لیکن بعض سطحی قسم کا ذہن رکھنے والے افراد روحانی بیعت سے اس وجہ سے گریز کرتے ہیں کہ ان کے خیال کے مطابق لفظ "بیعت" کے معنی کے اعتبار سے مرید اپنے آپ کو شیخِ دستگیر کے ہاں فروخت کر دیتا ہے۔ وہ اس طرزِ عمل کو غلامی کی زنجیر، انسان پر انسان کی خدائی اور ربّی پر شرک تصور کرتے ہیں حالانکہ ایسا تصور سراسر بطلان اور کوتہ چشمی کی دلیل ہے۔ لفظ "بیعت" اصطلاحی مفہوم کا ترجمان ہے۔ اگر یہ افراد محض اس لفظ کے معنوی تاثر سے خوف زدہ ہو کر بیعت کرنے سے گریز کریں تو انہیں دورِ رسالت کے مابعد زمانہ میں ہر رنگ کی مروجہ بیعت سے انکار کرنا پڑے گا جو کہ ناممکن ہے اور پوری تاریخِ دین پر لکیر پھیر دینے کے مترادف ہے۔ روحانی

بیعت کا منشور کلمۃ اللہ کا نفاذ، تزکیہ نفس، تصفیہ قلب ماسوا کی نفی اور حق کی اثبات ہے۔ یہ شرک نہیں بلکہ قاطع الشرک ہے۔

یہاں اس امر کی وضاحت کر دینا بھی لازمی ہوگا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے عزم صمیم پر قائم ہوئے بغیر محض رسمی طور پر بیعت کر لینا اور بعد ازاں اس کے تقاضوں کی تکمیل نہ کرنا راہ سلوک کے منافی ہے۔ بعض افراد کے نزدیک بزرگان دین کے حلقہ ارادت میں داخل ہونے کی صورت میں نزول رحمت باری تعالیٰ سے مستفیض ہونے کا مفہوم عجیب نوعیت کا حامل ہوتا ہے۔ ان کے ذہن میں طلب حق کا احساس برائے نام اور سطحی ہوتا ہے۔ یہ طلب دنیا کے اغلب احساس سے متاثر ہو کر بیعت کرتے ہیں اور اس سنت کو مرادوں کے حصول کا ذریعہ تصور کرتے ہیں۔ کئی افراد اس خیال کے زیر اثر ہوتے ہیں کہ بیعت ان کی اخروی زندگی میں بزرگ کی طرف سے شفاعت کا باعث بنے گی اور "سو سو گناہ کئے تیری رحمت کے زور پر" کے مصداق بیعت کے اصل مفہوم و مقصود سے پہلو تہی کر جاتے ہیں، حالانکہ بیعت حصول مراد کا ذریعہ نہیں اور نہ ہی قیامت کے دن کوئی شخص کسی دوسرے کی شفاعت کر سکے گا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہ۔ راہ سلوک کی تعلیمات میں وضاحت کے فقدان اور حب دنیا پر مشتمل جاہلانہ عقیدت مندی کی تاثیر سے نفس میں پیدا ہونے والے یہ وہ تصورات ہیں جو رسمی ارادت مندی کو جنم دیتے ہیں اور راہ سلوک کے اعلیٰ و ارفع نظریات کو بے جا طور پر داغدار کرتے ہیں۔ ارشاد ربانی "وَابْتَغُوْٓا اِلَیْہِ الْوَسِیْلَۃَ وَجَاھِدُوْا فِیْ سَبِیْلِہٖ" کے موجب حصول قربت الٰہی کیلئے وسیلہ تلاش کرنا ضروری ہے۔ طریقت و معرفت کی رُو سے یہ وسیلہ مرد کامل کا ہے جس کے دست حق شناس پر بیعت کی جائے اور جس سے روحانی

نسبت استوار ہو۔ بیعت کے بعد اللہ کے راستہ میں مجاہدہ فلاح یابی کیلئے
شرط ہے۔ کسی مردِ کامل کے ہاتھ پر محض بیعت کر لینا اور بعد ازاں مجاہدہ میں
تگ و دو نہ کرنا، حصولِ خیر کے ارادہ سے محروم رہنا۔ قلبی صدق قائم نہ رکھنا،
تقویٰ کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دینا اور اصولِ سلوک سے گریز کرنا بیعت کے مفہوم
کی نفی کرتا ہے۔ یہ طرزِ عمل حشر کے دن اپنے خلاف ایک اور گواہ کھڑا کر لینے
کے مترادف ہے جبکہ طلبِ حق میں بیعت کے تقاضوں کی تکمیل کرنا اور راہِ سلوک
کے اصولوں پر احساساً اور عملاً قائم ہونا اپنے حق میں ایک معتمد شہادت سے
مشرف ہونا ہے۔ مجاہدہ کے تصور سے گھبرا کر اس سے گریز کرنا جہالت ہے
اور رازِ حیات کو نہ سمجھنے کے مترادف ہے۔ عارفینِ اسلام کے نزدیک مجاہدہ
کوئی خلافِ فطرت مشق اور دین کی اجتماعی زندگی سے متصادم کوئی انوکھا طریقہ
نہیں۔ ذکر و فکر میں مسلسل خلوت نشینی یا سکرِ مقیم اور ترکِ دنیا کا معمول اپنائے
رکھنے سے عقلِ سلیم شعورِ انسانی اور اعضائے جسمانی کی عبادت معطل ہو کر رہ جاتی
ہے۔ لہٰذا دینِ اسلام فاقہ کشی، خلوت نشینی، عزلت گزینی، رہبانیت و ترکِ
دنیا اور طویل المعیاد زبان بندی کی طرز کے غیر فطری مجاہدات کا تقاضا نہیں کرتا
اسلام میں مجاہدہ نفس کے خلاف مسلسل جہاد کا نام ہے جو حیاتِ عنصری میں عائد
شدہ فرائض اور دیگر غیر ذاتی امور کی سرانجام دہی کے ساتھ ساتھ ہمہ
وقتی ذکر و فکر میں جہد جاری رکھنے سے انجام دیا جاتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ
سے انعام یافتہ لوگوں کی صراطِ مستقیم ہے جس پر گامزن ہونے کے لئے حالتِ
نماز میں باری تعالیٰ سے توفیق اور دعا مانگی جاتی ہے

حیاتِ عنصری میں سفرِ سلوک محمدیت کی طرف مسلسل دوڑ ہے۔ محمدیت
انسانیت کی جان اور مرشدیت محمدیت کی آن ہے۔ شیخ کامل کے ہاتھ پر روحانی

بیعت سلوک کا وہ زینہ ہے جس پر گامزن ہو کر معراجِ انسانیت کی طرف سفر کا آغاز ہوتا ہے اور سالک پر زندگی کے اسرار و رموز منکشف ہوتے ہیں۔ مسلسل ذکر و فکر اور جہد و زہد سے اُسے اپنی ہستی کا ادراک ہوتا ہے۔ نتیجتاً مقامِ مطمئنہ کی جھلک دکھائی جاتی ہے جیسے خلافتِ واصلہ پکار رہی ہوتی ہے۔ ''اِرْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً ‘‘۔ لیکن عشق میں مصروف سالک کے کسی باطنی مقام کو زبانِ حال سے کہنا پڑتا ہے کہ

ع کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

مقاصدِ انسانیہ کی انجام دہی ہجر و وصال کے مقامات میں وارد ہو کر ہر دو کے درمیان باہمی مقناطیسی کشش پیدا کرتی ہے اور شیخ کامل کے طفیل عشقِ حقیقی ایک ایسے رنگ میں نمودار ہوتا ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔ کوئی غیر اسلامی اور رہبانی مجذوبیت اس کا نمونہ پیش نہیں کر سکتی۔

(نوٹ):- محمدیت سے یہاں مراد مقامِ رسالت مآب ہے۔ جہاں انسانیت کی حقیقت اور ''خالص انسانیت'' کا مقامِ معراج جس کو محبوبِ حقیقی کے ساتھ نسبتِ خصوصی حاصل ہے۔ اس مقام کے انوارِ رحمت کے ہالہ میں داخل ہونے والوں کو تقربِ الٰہی ہوتا ہے اور اسی کے طفیل وصال و عرفان ہوتا ہے۔ نیز یہ کہ مرشدیت خالصتاً حال کا معاملہ ہے جو کہ محمدیت کی نمائندہ آن ہے۔

مرشدیت اور تصور شیخ

بیعت کے اعتبار سے شیخ کامل

طالب حق کو اکتسابِ عرفان کے لیے سب سے پہلے شیخ کامل کی تلاش ہوتی ہے۔ بیعت کے نقطۂ نظر سے کامل بزرگ کی تعریف اور اوصاف اور پہچان کی بابت مختلف حضرات کے نظریات اپنی اپنی علمی بصیرت، فہم و ادراک اور جوشِ عقیدت کیمطابق ملتے ہیں جن میں مطابقت اور مماثلت بھی ہے اور کسی حد تک تفریق و امتیاز بھی۔

اولیائے کرام سے صدورِ کرامات و مکشوفات کے تاریخی واقعات سے متاثر ہو کر بعض افراد بیعت کے لئے کسی ایسے بزرگ کے متلاشی ہوتے ہیں جس کی کرامات اور بصیرتِ کشف اسکی کاملیت کی دلالت کرتی ہوں۔ یہ درست ہے کہ بزرگوں سے کشف و کرامات کا صدور ہوتا ہے۔ لیکن ظاہری صدور گاہے گاہے اور بہت کم ہوتا ہے جبکہ معنوی صدور اکثر و بیشتر ہوتا ہے۔ یہ خالصتاً روحانی معاملہ ہے جو قدرتاً فی سبیل اللہ اور دین و عرفان کی حقانیت میں وقوع پذیر ہوتا ہے۔ اس میں کسی نمائش یا کبر کے ارادہ کو دخل نہیں۔ ظواہر کے اعتبار سے کسی بزرگ کی سب سے بڑی کرامت اس کی سیرت و کردار اور اخلاقِ حسنہ ہے۔ جیسا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "میری گذشتہ زندگی تمہارے سامنے ہے۔ پھر کیا تم نہیں سمجھتے؟"

"فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ"

اگر کسی کی حیاتِ عنصری سنتِ نبوی کے خلاف ہو اور اس کا گفتار و کردار اتباعِ سنت کے مطابق نہ ہو تو خواہ ہوا میں اڑتا ہو، پانی پر چلتا ہو یا آگ میں بیٹھتا ہو حدیث پاک کی روشنی

میں اس کی پیروی جائز نہیں۔ قبضہ جنات۔ کالا علم۔ تسخیر ہمزاد کے عمل اور دیگر کئی عملیات سے بھی اسی قسم کی شعبدہ بازیاں دکھائی جا سکتی ہیں۔ لہٰذا کسی شخص میں دیکھے جانے والے کسی معاملے کو صحیح روحانی کشف یا کرامت پر قیاس کر کے محض اسی وجہ سے اس سے بیعت کر لینا راہ سلوک کے منافی ہے۔ علاوہ ازیں ممنوعہ عملیات کی چلہ کشی سے دستِ تصرف میں آنے والے موکلات نفسِ انسانی کو انانیت کا وقار، خمارِ غرور، مستی بلند بانگ دعوؤں اور خباثت انگیز جرائم سے مزید مکدر کرتے ہیں۔ یہ شیطانی اعمال راہ سلوک سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔

کچھ حضرات کا نظریہ ہے کہ کامل شیخ وہی ہے جو بیعت لے کر مرید کو آن کی آن میں صیقل کر دے اور مرید جادۂ رسالت میں رے جائے۔ اگر کسی سالک کو بیعت کے فوراً بعد عملاً ایسی واردات پیش آئی ہو تو یہ مسئلہ استثنائی صورتِ حال کا ہے یا طالب کے انفرادی حال کا معاملہ ہے جس میں اس کی پیدائشی درویش منشی، بچپن کی تربیت، طبعی نیک سیرتی، بیعت سے قبل دیرینہ ریاضت، فسق و فجور سے گریز، جہدِ مسلسل اور خلوصِ دل سے اس کی دینی خدمات وغیرہ کو خاصا دخل ہے۔ اس ضمن میں اس کے زہد مسلسل اور زمانہ قبل از بیعت کے سالہا سال کے جہد و اکتساب کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اکتساب اسباب سے عبارت ہے اور اسباب مالک کے کرم کے ذرائع ہیں۔ قدرت خود اپنے کرم سے معاون اسباب مہیا کرتی ہے اور طالب اکتساب کے مراحل میں داخل کیا جاتا ہے۔ تاریخ تصوف کی روایات سے ظاہر ہے کہ کئی عظیم اولیائے کرام سے قبل از بیعت سالہا سال تک جہد و اکتساب کرایا گیا اور بعد ازاں رہبر ملنے پر اُن کے من کی دنیا یکسر بدل گئی۔ حضرت مولائے روم عمر بھر دینی خدمات و تحقیقات، اسلامی تبلیغات اور درس قرآن و حدیث میں مصروف رہے۔ قرآن و حدیث کی تعلیمات اُن کے رگ و ریشہ میں پیوست ہو چکی تھیں اور انجام کار عمر کے آخری حصہ میں رہبر ملنے پر اُن کے باطن کے پردے فی الفور چاک ہو گئے۔ اسی طرح جب حضرت بابا فرید الدین مسعود شکر گنج نے چھتیس ۳۶ سالہ کٹھن ریاضت اور مجاہدہ کے بعد

حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ سے بیعت کی تو اُسی دن خرقۂ خلافت سے نوازے گئے۔ اسی طرح اگر بالفرض یہ تسلیم کر لیا جائے کہ متذکرہ زیرِ تبصرہ نظریہ فلاں بزرگ شخصیت کے قول سے وابستہ ہے تو اس کا زیادہ سے زیادہ یہی مطلب لیا جا سکتا ہے کہ یہ ان کے انفرادی حال کے موجب تھا لیکن ان کا بیعت سے قبل دیرینہ مجاہدہ اور اکتساب کسی نہ کسی رنگ میں ضرور تھا۔ اگر عشق کی واردات عقلِ سلیم کے مدار پر سے گزرے بغیر نطق و بیان میں آ جائے تو اکثر اوقات پڑھنے سننے والے حضرات کے ذہن میں سلجھاؤ کی بجائے الجھاؤ کا باعث بن جاتی ہے۔ اس امر کو تسلیم کر لینا کہ کامل شیخ صرف وہی ہے جو کہ بیعت کے بعد مرید کو آن کی آن میں صیقل کرتے ہوئے سیدھا دربارِ رسالت میں لے جائے راہِ سلوک میں جہد و اکتساب کی اہمیت کو نظر انداز کر دینے کے مترادف ہوگا۔ اگر معاملہ واقعی ایسے ہی ہے تو اکثر صوفیا کو اپنے پیرانِ عظام سے بیعت کرنے کے بعد طویل المیعاد مجاہدات کے بعد خلافت نہ ملتی بلکہ سب کا مسئلہ راتوں رات حل ہو جاتا۔ مذکورہ نظریہ کی تائید و حمایت کی صورت میں ان کثیر التعداد سالکین کے پیرانِ طریقت کی کاملیت میں نقص کا اعتراض ابھرتا ہے جنہوں نے اپنے ان مریدین کو جو بعد ازاں بڑے بڑے نامور صوفیا بنے عرصہ دراز کے بعد خلافت سے نوازا۔ لہٰذا از روئے سلوک متذکرہ نظریہ کامل کی پہچان کا آفاقی اصول متصور نہیں ہو سکتا اور نہ ہی تاریخِ تصوف کی روشنی میں بحیثیتِ اجتماعی اس دو حرفی بات کی تائید و حمایت کی گنجائش ملتی ہے۔

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہوگا کہ شیخ کامل کی بیعت کے بعد سالکین پر نزولِ فیوض ہوتا ہے اکثر حضرات کو مقاماتِ سلوک اور اکتسابِ عرفان کے مراحل سے بتدریج گزارا جاتا ہے اور وسعتِ شعور کے ساتھ ساتھ ان پر زندگی کے اسرار و رموز کھلتے ہیں۔ لیکن یہ قطعی ضروری نہیں کہ بیعت کے بعد آن کی آن میں ہر ایک پر متذکرہ نظریہ سے متعلقہ واردات گزری ہو۔ اگر کوئی سالک بیعت کے بعد ابتدا میں کسی ایسی واردات سے ہمکنار نہ ہوا ہو لیکن وہ شیخ کامل کی پہچان

کے مذکورہ نظریہ کو محض اس وجہ سے معتبر تصور کر بیٹھے کہ یہ کسی بزرگ کے قول سے منسوب ہے تو اس کا یہ انداز فکر اپنے شیخ کی کاملیت میں بے جا شبہ اور وہم کے مترادف ہوگا۔ ایک ایسا وہم جو جاہلانہ عقیدت مندی اور سنی سنائی روایات پر بلا تامل یقین کی غلط پیداوار ہے۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ عبور منازل کیلئے جہد و اکتساب اور ریاضت و مجاہدہ میں صبغۃ اللہ کی چھاپ اس وقت منقش ہوتی ہے جب سالک کے قلب و ذہن میں یہ حقیقت پیوست ہو جائے کہ جو کچھ بھی کرایا جا رہا ہے مالک کی عطا اور دین ہے۔ سب اکتساب اسی کے کرم کے طفیل ہو رہا ہے نیز یہ کہ اس ضمن میں اس کی اپنی کوئی ہمت نہیں نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ، (البقرہ ۳۰) کا اظہار کرنے والے خلافت کے اہل نہ تھے۔

عام مسلمہ نظریہ ۔ اکثر و بیشتر حضرات کا نظریہ یہ ہے کہ بیعت لینے کی اہلیت کے نقطہ نظر سے کامل شیخ وہی ہو سکتا ہے جو صاحب اجازت و خلافت ہو، شرع محمدیؐ پر عمل پیرا ہو اور اس کا کوئی قول و فعل خلاف سنت نہ ہو۔ کامل اتباع سنت بزرگ کی کاملیت کی بہت بڑی دلیل ہے۔ ایک دفعہ حضرت جنید بغدادی کے پاس ایک شخص مرید ہونے کی غرض سے حاضر ہوا۔ اس کا اپنے دل میں ارادہ یہ تھا کہ وہ حضرت موصوف میں کوئی کرامت دیکھ کر بیعت کرے گا۔ وہ ان کے درویش کدہ پر بیعت کا مدعا بیان کئے بغیر کئی دن تک قیام پذیر رہا لیکن اپنے خیال کے مطابق حضرت موصوف کی کوئی کرامت نہ دیکھ سکا۔ جب واپسی کی اجازت مانگی تو حضرت موصوف نے اس سے آنے کا مدعا پوچھا۔ اس شخص نے عرض کیا۔ حضور! میں آپ سے بیعت کرنے کی نیت سے آیا تھا۔ لیکن دراین عرصہ کوئی کرامت نہیں دیکھ سکا۔ حضرت موصوف نے اس سے پوچھا۔ "کیا تم نے مجھ میں دراین عرصہ کوئی بھی ایسی بات دیکھی ہے جو شرع محمدیؐ کے خلاف ہو؟" اس شخص نے نفی میں جواب دیا تو حضرت موصوف نے فرمایا۔ "یہ بہت بڑی کرامت ہے" وہ شخص مطمئن

ہو گیا اور آپ کے حلقہ ارادت میں داخل ہو گیا۔ حضرت جنید بغدادی شریعت اسلامیہ پر عمل پیرا ہونے کے ساتھ ساتھ اہلِ حال و صاحبِ نظر اور مستند روحانی سلسلہ کے حامل بزرگ تھے۔

ظاہر کے اعتبار سے بیعت لینے کے مجاز حضرات کی بابت مذکورہ نظریہ بالکل درست ہے۔ لیکن جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ روحانی بیعت کا اصل مقصود اسلامی طرزِ حیات کے راستہ سے اصلاحِ نفس اور اکتسابِ عرفان ہے، لہٰذا طالبِ حق کے لئے متذکرہ نظریہ میں مندرجہ کوائف کے باطنی پہلو سے قبل از بیعت اطمینان حاصل کر لینا ضروری ہے۔ یعنی یہ کہ سلسلہ مستند ہو۔ مجازہ شخصیت کی خلافت اس کے اہلِ حال ہونے کی عکاس ہو اور مریدین پر حال کا رنگ دکھائی دیتا ہو۔ مگر حال کا صحیح ادراک اپنے اوپر حال وارد ہونے سے ہوتا ہے۔ لہٰذا اہلِ طلب حضرات کو متذکرہ نظریہ کی مزید توضیح ان الفاظ میں ملتی ہے کہ کامل شیخ وہی ہو سکتا ہے جو صاحبِ خلافت اور متشرع ہو، حرص و ہوس اور متاعِ دنیا کے لالچ سے مبرا ہو، شفقت و اخلاقِ محمدی کا صحیح نمونہ ہو اور اس کی سیرت میں صفاتِ محمدی کا صحیح عکس پایا جائے نیز یہ کہ بیعت میں داخل کرتے وقت جب وہ ذکر کرائے تو مریدین کا قلب آن کی آن میں ذاکر ہو جائے، جسم پر رقت طاری ہو جائے اور یوں محسوس ہو گویا جسم کسی کی گرفت میں آ چکا ہے۔"

کامل کی بیعت سے کچھ عرصہ بعد کثرتِ فیوض کا نزول ہونا، قلب کا ہمہ وقتی حالت میں ذاکر ہونا یا اس کے برعکس روحانیت کا انقباض انضباط ہو جانا، یہ وہ کیفیات ہیں جن کے طاری ہونے میں بیعت کے بعد مرید کی طرف سے ہونے والے جہد و اکتساب اور خضوع و خشوع یا عدم توجہ یا عدم رجوع کا خاصا دخل ہے۔ لہٰذا بیعت کے بعد کافی عرصہ تک مرید کا اپنے شیخ سے بظاہر گہرا رابطہ قائم رکھنا مستحسن اقدام ہے کیونکہ ظاہر باطن پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ کامل کی بیعت کے فوراً بعد بوقتِ ذکر قریباً تمام مریدین پر شیخ

کی کاملیت کی متذکرہ شناختی کیفیت گزرتی ہے۔ لیکن اگر کسی مرید پر کسی وجہ سے یہ کیفیت فی الفور نہ گزرے جبکہ اُسی بزرگ کی بیعت دیگر حضرات مذکورہ کیفیت سے ہمکنار ہوئے ہوں یا ہوتے ہوں تو مرید کو ایسی پیش آمدہ استثنائی صورتِ حال کو اپنی کسی نامعلوم خامی پر مبنی تصور کرنا پڑتا ہے، اس لئے کہ وہ محرومِ فیض رہا جبکہ دوسرے فیضیاب ہوئے۔ اُس کا باطنی معاملہ عموماً چند روز کے ذکر و فکر سے کما حقہٗ درست ہو جاتا ہے اور شیخ سے اس کی روحانی وابستگی قائم ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر اس کے باوجود خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہو سکے تو طالب کے لئے یہ سمجھ لینے میں کوئی قباحت نہیں کہ وہاں پر سے اُس کو فیض مقسوم نہ تھا۔ محرومیت کی ایسی صورتِ حال میں طالبِ حق مناسب عرصہ کے بعد کسی دیگر بزرگ سے بیعت کی تجدید کر سکتا ہے۔

آئینہ حال میں مرشدیت شیخ کامل کی بیعت میں داخل ہونے سے کم و بیش عرصہ کے بعد اہلِ طلب حضرات ایسی کیفیات سے ہمکنار ہوتے ہیں جو اُن کی روحانی نسبت کی استواری کی باطنی دلیل بنتی ہیں۔ وہ معرفت کی بیعت میں داخل ہو جاتے ہیں۔ سالکین جو کہ قبل ازاں "اصحاب پیر" تھے "اصحاب مرشد" ہو جاتے ہیں اور انہیں آئینہ حال میں مرشد اور مرشدیت کا ادراک ہوتا ہے۔ "صاحب مرشد" ہونے کی بنیادی علامات یوں ہیں کہ مرشد کے دیدار سے طالب کے قلب میں سوز پیدا ہو اور مرشد کی شبیہ میں طالب مقناطیسی کشش پائے۔ یہ کشش شیخ طریقت سے روایتی یا جذباتی عقیدت، اس کے علوم و معارف اُس کے شخصی فضائل و خصائل یا اس کی بابت سُنی ہوئی یا اس میں دیکھی گئی ظاہری کرامات کے اثر سے نہیں ہوتی بلکہ خالصتاً روحانی قسم کی ہوتی ہے۔ اس مرحلہ پر اپنے آپ کے ادراک کا معاملہ شروع ہوتا ہے اور سالک کو سب کچھ اپنے وجود میں دیکھنا ہوتا ہے کیونکہ انسان عالمِ اصغر اور زبدۃ الکائنات ہے۔ طلبِ حق میں سالک کا قدم مرشدیت میں رواں دواں ہوتا ہے۔ ظاہر کے اعتبار سے ملنے والا مرشد کا تصور باطن میں ختم ہو کر نکھرتا ہے۔

اور محمدیت کی نمائندہ آن یعنی مرشدیت ایک راہنما مقناطیسی تصور بن کر اُبھرتی ہے۔ مرشدیت سالک کی ہر آن پیش قدمی میں جمود اور ٹھہراؤ کا تقاضا نہیں کرتی بلکہ ماسوا کی نفی کا تقاضا بیدار کرتے ہوئے حق کی اثبات کا ذوق تازہ کرتی رہتی ہے، سانس کی ہر آمد ان میں جانب قلب رجوع دلاتی ہے اور معرفت و حقیقت کے ارتقائی مقامات کی طرف کھینچتی ہے۔

مرشد کا تصور جس قدر سالک کے افکار پر حاوی ہو اسی قدر انوار کا سرچشمہ ثابت ہوتا ہے۔ سالک کو زمان و مکان کی پابند اور محتاج خارجی دنیا کو نگاہِ عمل میں موجود اور نگاہِ فکر میں معدوم تصور کرنا پڑتا ہے اور اپنے افکار کی ایسی کائنات میں سفر کا آغاز کرنا ہوتا ہے جس میں بُعد اور قرب، زمان و مکان اور قدر و جبر آن کی آن متبادل رنگ میں تغیر پذیر معلوم ہوتے ہیں۔ اس سفر میں راست روی اور استقلال مرشد پاک کے تصور سے ہی پیدا ہوتا ہے اور مرشدیت سالک کے قول و فعل میں بہتر زاویوں کی طرحدار ثابت ہوتی ہے۔ سفر سلوک کے جملہ معاملات پر مرشد کا تصور حاوی ہوتا ہے۔ یہ تصور جامع الانوار مانع الخرافات قاطع الوساوس اور دافع الظلمات ہے۔ یہی عرفانِ حقیقت کی نمود ہے جو نکھرتی جاتی ہے۔ آئینہ حال میں یہ حقیقت ہر اہلِ سلوک پر بحدِّ نظر، بحدِّ توفیق اور بموجبِ کرم واضح ہوتی ہے۔

تاہم اس حقیقتِ حال سے اس قدر آگاہی لازم ہے کہ مرشد کا معاملہ قال سے گزرا ہوا معاملۂ حال ہے۔ مرشد ایک ہی ہوتا ہے البتہ ہر اہلِ طلب پر اس کی آن منفرد ہوتی ہے۔ نیز ہر سالک جو کہ "صاحبِ پیر" ہو ضروری نہیں کہ "صاحبِ مرشد" بھی ہو چکا ہو۔ مرشد ہمیشہ کامل ہوتا ہے اور اسی کے ذریعے سلوک کے مقامات طے ہوتے ہیں۔ محمدیت کی یہ نمائندہ آن بلاشبہ طلبِ حق اور عرفانِ حقیقت میں دستگیر ہے۔ جب اہلِ حال حضرات کا نسبتِ روحانی کے ارتقائی مقامات سے گزران ہوتا ہے تو وہ مرشدیت کی ارتقائی آنوں سے بھی واصل ہوتے ہیں۔ جذب و استغراق کے عالم میں اِن آنوں کی تشبیہات میں تبدیلی بھی ہوتی ہے اور تصورِ شیخ اور ان تشبیہات کا باہمی انضمام بھی۔ مگر بایں ہمہ تمام مظاہر کمال ہونے پر تصورِ شیخ ترک نہیں کیا جاتا ۔۔۔۔ ایسے مراحل میں

طالب کے لئے تصورِ شیخ سے وابستگی قائم رکھنا لازم ہے۔ یہ "صاحبِ پیر" ہونے کا نہیں بلکہ "صاحبِ مرشد" ہونے کا مقام ہے جس پیر کے طفیل طالبِ حق صاحبِ مرشد ہوتا ہے طالب کو اپنے باطنی افکار میں اُس کی حیثیتِ شخصی کی نفی کرنا پڑتی ہے۔ اس مرحلہ پر پہنچ چکنے کے بعد طالبینِ حق کو نہ تو اس بات سے غرض رہ جاتی ہے کہ شیخ کا ظاہر کیسا ہے اور نہ ہی یہ جاننے کی ضرورت ہوتی ہے کہ اس کا باطنی اور روحانی مقام کیا ہے۔ یہ دونوں پہلو شیخ کی شخصیت سے وابستہ ہیں اور غیر نبی کی شخصی اکملیت میں خلا کوئی غیر امکانی بات نہیں۔ درایں حال طالب کو مرشدیت کی آنِ حق نما سے وابستگی قائم رکھنا پڑتی ہے جو اُسے شیخِ طریقت کی نسبت بیعت کے وسیلہ سے حاصل ہوئی۔ ایسی صورت حال میں طالبین کی باطنی دُنیا میں اُسی شیخِ طریقت کا تصور زندہ ہونا ہے جو صحیح روحانی سلسلۂ خلفاء سے منسلک ہو۔ یعنی جس کا سلسلہ درست اور کامل ہو۔ خواہ وہ بجائے خویش واصل باللہ ہو یا مقامات میں رواں دواں۔

تصورِ شیخ فرمانِ نبوی ہے " تم اپنے رب کی عبادت ایسے کرو گویا تم اُسے دیکھ رہے ہو۔ اگر تم ایسا نہ کر سکو تو (یہ سمجھو کہ) وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ عبادت میں دید کا یہ پہلو بے صورت کی تجلّی کسی صُورت میں دیکھنے کی نشان دہی کرتا ہے۔ ایک ایسی شبیہ میں جو علوم قرآن و حدیث کے مطابق خالق کی تخلیق کا بہترین شاہکار اور اسکی صفت خالقیت کا بہترین مظہر ہو، اس لئے کہ فرمانِ نبوی کے مطابق باری تعالیٰ کی ذات میں فکر کی بجائے اس کی صفات میں فکر کی تلقین ملتی ہے۔

انسان خلیفۃ اللہ فی الارض ہے جس کی تخلیق احسنِ تقویم میں ہوئی۔ علاوہ ازیں احادیثِ پاک " خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ " اور " مَنْ رَاٰنِیْ فَقَدْ رَاَ الْحَقَّ " بھی اس امر کی دلالت کرتی ہیں کہ شبیہِ انسانی باری تعالیٰ کی صفتِ خالقیت کا بہترین مظہر ہے۔ لہٰذا عبادت میں دید کا متذکرہ پہلو شبیہِ انسانی تک رسائی حاصل کرتا ہے۔

اور سفرِ سلوک میں سالک کو اکتساب عرفان کے لئے نائب رسولؐ یعنی شیخ کامل کے تصور کی ضرورت درپیش ہوتی ہے کیونکہ اس کے لئے اسی مقام پر سے عرفانِ حق کی نمود ہوتی ہے۔ یہاں یہ نکتہ بھی پیشِ نظر ہو کہ تصورِ شیخ دراصل باری تعالیٰ کی صفاتی شان میں تفکر کے لئے کیا جاتا ہے۔ اگر ذاتی شان میں تفکر کے لئے کیا جائے تو یہ اقدام اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے کیونکہ قرآنِ حکیم کے ارشاد کے مطابق اللہ کی ذات ایسی ہے کہ کوئی شئے اس کی مثیل نہیں۔

باطنی طور پر ہر سالک کا مرشد انفرادی آن میں ہوتا ہے جس کا تصور سالک کو اپنے جسم پر طاری رکھنا ہوتا ہے اور قلب کو اس تصور کے انوارِ حق نما سے صیقل کیا جاتا ہے جسم پر تصور طاری کرنے میں ایسے تقلیدی رنگ کی ضرورت ہوتی ہے کہ سالک کو جسم و لباس سمیت اپنا آپ آنِ شیخ میں محسوس ہو قطع نظر اس سے کہ اس کا بظاہر قد و قامت اور لباس و پوشاک جیسے بھی ہو۔ سفرِ سلوک میں اہلِ طلب حضرات کو اپنے شیخ کے تصور میں اپنی نفسانی انانیت کی نفی کا تصورِ پختہ ترکرنا پڑتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ہمہ وقتی ذکر پاس انفاس کے دوران " لَآ اِلٰہَ " کے الفاظ کے ساتھ شیخ سمیت ہر شئے کی نفی کی جاتی ہے اور " اِلَّا اللّٰہ " کے الفاظ سے قلب پر حق کی اثبات کی جاتی ہے۔ ایسے مستمراری طرزِ عمل سے قلب بتدریج صیقل ہو کر انوار و تجلیات سے معمور ہوتا ہے۔ ھوئہ خالص انسانیت " اجاگر ہوتی جاتی ہے۔ جن حضرات میں تصورِ شیخ کی عادت پختہ ہو جاتی ہے وہ اکثر و بیشتر پیشانی پر دو ابروؤں کے عین درمیانی مقام پر نگاہ جما کر تصور قائم کرتے ہیں یہاں سے تصور کے انوار جانب قلب بڑھتے ہیں اور قلب کی صفائی ہوتی ہے۔

اہلِ حال حضرات کا تجرباتی انکشاف ہے کہ تصورِ شیخ عبورِ منازل میں بہترین دستگیری کرتا ہے۔ یہ راہِ سلوک کی روح رواں ہے۔ سوز و عرفان کی یہ شمع نورِ سالک و مسلوک، ساجد و مسجود، مجوز و مجوز، عابد و معبود، طالب و مطلوب اور واصل و موصول کے درمیان ایک رازاور وسیلۂ ربط ہے۔

ذکر و اذکار

لغوی اعتبار سے لفظ "ذکر" سے مراد "یاد" ہے جبکہ راہِ سلوک میں ذکر سے مراد ذکرِ الہٰی ہے جس میں سالک کو ہمہ وقتی حالت میں مستغرق رہنا ہوتا ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا۔ (المزمل-۸) یعنی اپنے رب کا ذکر کرو اور ہر طرف سے ٹوٹ کر اسی کے ہو جاؤ۔ ہر طرف سے ٹوٹ کر اسی ایک ہستی کے لئے موقوف رہنے سے مراد یہ ہے کہ سالک کی طرف سے انجام پذیر ہونے والے جملہ امور صبغۃ اللہ کی ان مٹ چھاپ سے منقش ہوں۔ دیدنی شنیدنی، کردنی اور گفتنی امور کی سرانجام دہی خالصتاً فی سبیل اللہ ہو۔ ہر عمل ذکر کا ضمیمہ ہو۔ ہر قول مقاصدِ دینِ فطرت کے اتباع میں ہو اور اعضائے جسمانی کو مالکِ حقیقی کی مشیت کے نفاذ کے لئے مکمل طور پر تصرف میں لایا جائے۔ نیز حواسِ خمسہ کا باطنی کردار بھی فطرتِ صحیحہ کی مشیت کے تابع ہوتا جائے۔ ذکر کی اس گہری مقصدیت کی تکمیل کے لئے ذکر اپنے ساتھ فکر کا متقاضی ہے۔ اس لحاظ سے ذکر اور فکر لازم و ملزوم ہو جاتے ہیں۔

ارشادِ ربانی: "فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ" (البقرہ-۱۵۲) پس تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد رکھوں گا۔ اس حقیقت سے پردہ کشائی کرتا ہے کہ ذکر

ایک نغمۂ عشق ہے جس کے واضح اثرات ہیں۔ ایک عمل ہے جس کا ٹھوس ردِ عمل ہے اور ایک صدا ہے جس کی باقاعدہ صدائے بازگشت ہے اللہ تبارک تعالیٰ کلام پاک میں اپنے نیک بندوں کے بارے میں فرماتے ہیں۔

یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِہِمْ ۔

(آل عمران ۔ ۱۹۱) ۔ یعنی وہ کھڑے ہوئے بیٹھے ہوئے اور کروٹیں لیتے ہوئے (ہر حال میں) اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں۔ مذکورہ آیت کی روشنی میں ذکر الٰہی ہمہ وقتی تسلسل کا متقاضی ہے۔ یعنی یہ کہ حالتِ ہوش حالتِ سکر اور حالتِ خواب میں اس کے جاری و ساری ہونے میں کوئی جمود اور ٹھہراؤ نہ واقع ہو۔ یہ مشغلہ مومنین صلوٰۃ دائمی ہے بقولہٖ تعالیٰ "اَلَّذِیْنَ ھُمْ عَلٰی صَلَاتِہِمْ دَائِمُوْنَ" (المعارج ۔ ۲۳)

صوفیا و سالکین کے حلقوں میں کئی مختلف الفاظ و کلمات میں اذکار الٰہیہ کا ورد کیا جاتا ہے۔ کچھ حضرات کا معمول اکثر و بیشتر حمد و ثنا، تسبیح و تقدیس اور تکبیر وغیرہ کے الفاظ و کلمات کا ورد ہوتا ہے۔ بعض حضرات اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں میں سے کسی نام بالخصوص جمالی صفاتی نام کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ بعض اصحاب کی طریقتِ مرشدیت میں اسم ذات یعنی لفظ "اللہ" کا ذکر خصوصی اہمیت کا حامل ہے جبکہ بعض حضرات شیخ طریقت کی اجازت سے کلمہ طیبہ کے ذکر میں مستغرق رہتے ہیں۔

افضل الذکر جملہ اذکار کا ورد بجا اور درست ہے۔ لیکن فرمان نبوی کے مطابق کلمہ طیبہ کا ورد افضل الذکر ہے "اَفْضَلُ الذِّکْرِ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ" (حدیث پاک) حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک اور حیاتِ طیبہ قرآن کی تفسیر ہے اور قرآن پاک کلمہ طیبہ کی شرح و بسط

ہے۔ کلمہ سے زیادہ جامع کوئی ذکر نہیں کیونکہ یہ ماسوا کی نفی حق کی اثبات اور اقرارِ رسالت یعنی تینوں پہلوؤں پر مشتمل ہے۔ کلمہ کے فضائل کے بارے میں فرمانِ نبوی ہے۔

"مَنْ قَالَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ الرَّسُوْلُ اللّٰہِ اِیْمَانًا وَّ اِحْتِسَابًا فَقَدْ دَخَلَ الْجَنَّۃَ ط۔ یہاں یہ نکتہ بھی پیشِ نظر ہو کہ کامل ایمان و احتساب محض زبانی اقرار اور وِرد سے حاصل نہیں ہوتا کیونکہ حدیثِ پاک کے مطابق ایمان تین چیزوں سے عبارت ہے یعنی زبان سے اقرار کرنا، دِل سے تصدیق کرنا اور اعضا سے عمل کرنا۔ زبان سے اقرار اور اعضا سے عمل کا تعلق ظاہری معمولات سے ہے جبکہ دل سے تصدیق کا تعلق باطنی احساسات سے وابستہ ہے۔ باطنی احساسات کو فطرتِ صحیحہ کے زیرِ اتباع کرنے کے لئے تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب لازم ہے۔ لہذا صحیح قلبی تصدیق کے حصول کے لئے باطن کی اصلاح از بس ضروری ہے۔ نفسانی طہارت اور قلبی صفائی کے حصول اور باطنی احتساب کے لئے نفی اثبات کی طریقت سے کلمہ کا ہونے والا ذکر فطری طور پر نسخہ کیمیا ثابت ہوتا ہے۔

کلامِ ربانی :۔ "یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِہِمْ" کے مصداق ہمہ وقتی حالت میں ذِکر کا تکرار جاری رکھنے کے لئے وہی موزوں ذکر ہے جسے اسلام میں "افضل الذکر" کہا گیا ہے۔ چنانچہ وقتاً فوقتاً "ذکر" حسب طریقت وظائف و اوراد کا معمول اپنانے کے باوجود اس امر کی ضرورت بدستور باقی رہتی ہے کہ کلمہ کا ذکر اس طریقہ سے کیا جائے جس کی بدولت اس کا ہمہ وقتی تسلسل قائم دائم رہ سکے۔ ایسا تسلسل جو طعام و کلام اور آرام کی ہر حالت میں اٹوٹ ثابت ہو۔ صوفیا و عارفین کے نزدیک

یہ طریق ذکر کلمہ کا ذکر پاسِ انفاس ہے جو نفی اثبات کی طریقت سے سانس کی آمد و رفت کے ساتھ بذریعہ سانس کیا جاتا ہے۔ اسی طریق عمل سے حالتِ ہوش، حالتِ سکر اور حالت نوم میں ذکر کا ہمہ وقتی تسلسل قائم رکھنے میں جہد کیا جاتا ہے۔ کلمہ کا حصہ اول یعنی "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ" کا ورد ہمہ وقتی اعادہ کا متقاضی ہے جبکہ "محمد الرسول اللہ" کے الفاظ پر مشتمل حصہ دوم کا ذکر وقفوں کے بعد کسی وقت کیا جاتا ہے۔ یعنی پہلا حصہ برائے تکرار ہے اور دوسرا حصہ برائے اقرار۔

ذکرِ نفی اثبات مسافر سلوک کو اکتساب عرفان کیلئے "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ" کا ذکر ہمہ وقتی حالت میں سالکانہ نقطہ نظر کے مطابق جاری رکھنا ہوتا ہے۔ ذکرِ نفی اثبات کوئی الگ ذکر نہیں بلکہ اسی ذکر کا سالکانہ اور عارفانہ انداز ہے جو کہ متذکرہ الفاظ پر مشتمل ہر طرز کے ذکر کے ساتھ اپنایا جاتا ہے اور عام حالت میں سانس کے ساتھ جاری رکھا جاتا ہے۔ تصورِ شیخ راہِ سلوک کی روحِ رواں، مرجع سوز پروری، آئینِ حق کی نمود اور جامع الانوار ہے۔ لہٰذا اس ذکر کے ساتھ از روئے سلوک شیخ کا تصور لازمی ہے۔ سالک کو تصورِ شیخ میں لَا اِلٰہ کے الفاظ سے ماسوا کی نفی اور اِلَّا اللّٰہ کے الفاظ کے ساتھ حق کی اثبات کرنا پڑتی ہے۔ انسان بجنس خویش اور بجائے خود ایک کائنات ہے اور عالم اصغر ہونے کی حیثیت سے اس میں سبع سموٰت والارض کی جلوہ آرائی ہے۔ سالک کی نگاہِ نکتہ ظاہر کی آنی فانی کائنات کی زمان و مکان پر مبنی وسعتوں اور فاصلوں کو معدوم تصور کرتی ہے اور "مرا از خود بروں رفتن محال است" کے مصداق سالک اپنے

وجود میں حقیقت کا مشاہدہ کرتا ہے۔ نفی اثبات کے ذکر میں اپنے وجود پر کلمہ کا نفاذ کیا جاتا ہے۔ سانس اندر لیتے وقت "لَا اِلٰہَ" کے الفاظ دہرائے جاتے ہیں اور سانس باہر نکالتے وقت "اِلَّا اللّٰہ" کا ذکر کیا جاتا ہے۔

صوفیا اور فقرا کی عارفہ تحقیق اس حقیقت سے پردہ کشائی کرتی ہے کہ جملہ شیطانی، نفسانی اور ملکوتی قوتوں کا عمل دخل ایک بالاتر نظام کے تحت وجودِ انسانی سے وابستہ ہے۔ جملہ اہلِ حال حضرات کو باطنی طور پر بحدِ بصیرت اس انکشاف کی تصدیق ملتی ہے۔ یہ اہلِ حال کا تجرباتی اور مشاہداتی معاملہ ہے جس سے کسی کو انکار کورچشمی پر مبنی ہوگا۔ قرآن پاک میں باری تعالیٰ کی طرف سے سبع سمٰوٰت والارض انسان کے زیرِ تسخیر قرار دئے گئے ہیں اور اہلِ حال حضرات کا متذکرہ انکشاف قرآن پاک کے اس انکشاف سے خاص مطابقت رکھتا ہے۔

خطراتِ ماسوا کی نفی ذکر کے آغاز میں "لَا اِلٰہَ" کے الفاظ تک ماسوائی خطرات کی نفی کی جاتی ہے۔ یہ خطرات تین معروف اقسام پر مشتمل ہیں یعنی خطراتِ شیطانیہ، خطراتِ نفسانیہ اور خطراتِ ملکوتی۔ انسان کے وجودِ عنصری میں ان کے مرکز اور محور کے طور پر تین خاص مقامات ہیں۔

خطراتِ شیطانیہ کا خصوصی تعلق بائیں گھٹنے کے مقام سے وابستہ ہے جو ان خطرات کا مصدر ہے۔ یہاں سے شیطانی وساوس، لایعنی خیالات، فتنہ پرور تصورات، شہوانی ترغیبات اور حسد و بغض اور کینہ پروری کے جذبات وجود بہ وجود میں آتے ہیں۔ یہ آن کی آن میں وجدان پر حملہ آور

ہوتے ہوئے نفسِ انسانی کو محسوساتی یا غیر محسوساتی ہر دو طریقوں سے گمراہی کا شکار بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

خطراتِ نفسانیہ کا خصوصی تعلق دائیں گھٹنے کے مقام سے وابستہ ہے۔ فسق و فجور، خیالاتِ فاسدہ، خود غرضی، مفاد پروری، لذات جوئی، عیش کوشی، تن آسانی، من مانی، جبر و تشدد اور حق تلفی وغیرہ کے جملہ نفسانی وساوس کا اس مقام سے خاص رابطہ ہے۔ نفسانی خباثتیں اس مقام سے ایسی وابستگی رکھتی ہیں جس کی مکمل تشریح احاطہ عقل و بیان سے باہر ہے۔ نفس کی شاطرانہ چالوں، روباہ بازی، کج فطری، خمابوئی، درخواہشات آفرینی کو اس مقام کے ساتھ نسبتِ خصوصی حاصل ہے۔

خطراتِ ملکوتی کا تعلق دائیں اور بائیں کندھوں پہ کے مقام سے وابستہ ہے۔ خیر و شر کے میزان کی اس مقام سے خاص نسبت ہے شکل و ہیئت کے اعتبار سے میزان سے مشابہت رکھنے والے اس مقام پر ایک بالاتر نظام کے تحت انجام پذیر ہونے والی ملکوتی کارگزاریوں کا ردعمل ہوتا ہے۔ سالک کے ذہن میں پیدا ہونے والے تعمیری احساسات، اصلاحی جذبات، حکمت آمیز تصورات، خیالاتِ حسنہ اور عباداتی رجحانات کا اس مقام سے بھی رشتہ ہے۔ فطرت کی تعمیری کارروائی، عباداتی امور کی سرانجام دہی اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے جملہ خیالات کی شعاعیں اس مقام کے ساتھ خصوصی نسبت رکھتی ہیں۔ لیکن حیاتِ عنصری میں سالک کے ساتھ نفسانیت کا تعلق بھی موجود ہوتا ہے۔ لہٰذا نیکی اور عبادت کی ترغیبات اکثر اوقات اجر و ثواب کے مدعا کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہیں۔ راہِ سلوک کی آخ بلندی اجر و ثواب سے بے نیاز رہنے کا تقاضا کرتی ہے اور مقاصدِ فطرت

کی تکمیل میں عشقِ حقیقی اس کا مطمحِ نظر ہوتا ہے۔ نگاہِ عشق میں مقامِ اجر و ثواب فی الحقیقت مقامِ ہجر و حجاب ہے۔ حقیقی عشق میں عبادات اور ذکر و فکر کا تقاضا حصولِ جنت اور حور و قصور نہیں کیونکہ یہ چیزیں من حیث الجماعت مخلوقات میں شامل ہیں۔ لہذا عبادت کا اصل مقصود عرفانِ حقیقت ہے۔ ذکر و فکر میں کسی ایسے وسوسہ یا خیال کو خاطر میں نہیں لایا جاتا جو فوری یا انجام کار مفاد یا اجر کا داعی ہو بلکہ ہر عمل بطور فرض سر انجام دیا جاتا ہے۔ حیاتِ عنصری میں نفسانیت کا تعلق ساتھ وابستہ ہونے کی وجہ سے ذکر و فکر کے دوران پیدا ہونے والا اجر و ثواب کا معمولی خیال بھی آن کی آن میں ارتقا پذیر ہو کر بسا اوقات نفس کے بہت بڑے مکر میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ علاوہ ازیں آتشِ جہنم کے خوف سے کی جانے والی عبادت بھی گوہرِ مقصود سے دور رکھتی ہے۔ لہذا سالک کو عذاب و ثواب کے احساسات سے بے نیاز ہو کر اپنا مشن جاری رکھنا ہوتا ہے اور ہر خیال اور ہر وسوسہ کی صریحاً نفی کرتے ہوئے بمنزل اثبات رواں دواں رہنا پڑتا ہے۔

گر خدا داری زغم آزاد شو
از خیالِ بیش و کم آزاد شو

حق کی اثبات | "لَا اِلٰہَ" کے الفاظ کے ساتھ ماسوائی خطرات و مقامات اور ہر جذبہ کی نفی کرنے کے بعد "اِلَّا اللّٰہ" کے الفاظ دہرائے جاتے ہیں۔ "اِلَّا اللّٰہ" ایک ضرب ہے جو قلب کے اوپر لگائی جاتی ہے اور قلب سے ماسوائی کثافتوں کے استخراج کا ذریعہ ثابت ہوتی ہے۔ قلب میں مقامِ رحمانی ہے جہاں پر سے عارفین کو تجلیاتِ حق کا دیدار و عرفان ہوتا

ہے۔ اِلّا اللہ کے الفاظ میں جب لفظ "اللّٰہ" کا ذکر ہوتا ہے تو مُرشدِ پاک کی آنِ حق نما کے وسیلہ سے قلب انوار و تجلیاتِ حق سے معمور ہوتا جاتا ہے اور ذکر و فکر میں طویل مجاہدہ کے نتیجہ میں ماسوا کی نفی ہونے کے ساتھ حق کی اثبات واضح تر ہوتی جاتی ہے۔ پابند معمول سالکین کو تصورِ مُرشد کے انوار سے مستفیض ہونے کے نتیجہ میں حق کی اثبات کی بابت مقامِ قلب پر جو بھی باطنی واردات پیش آئے وہ عین حال کا معاملہ ہے جس پر یہاں تبصرہ مقصود نہیں۔ حق کی اثبات میں اکتساب بموجب کرم ہوتا ہے۔ لیکن کلامِ ربانی "لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی" (النجم۔ ۳۹) کے پیشِ نظر اس ضمن میں جہد سے پہلو تہی کسی طور سے بھی مناسبِ حال نہیں۔

حق کی اثبات سے بہرہ ور ہونے کے نتیجہ میں سالک پر زندگی کے اسرار و رموز منکشف ہوتے ہیں۔ اثباتی تجلیات کی مکمل وضاحت احاطہ عقل و بیان سے باہر ہے۔ البتہ اثباتی کیفیات کے ردِ عمل کو مقیاسِ اثبات گردانتے ہوئے اتنا واضح کر دینا ضروری ہے کہ اصلاً صحیح اثبات وہی ہے جس کے نتیجہ میں "لا" کی تلوار کے ساتھ حواسِ خمسہ پر ایسے حقانی امتناع کا نفاذ ہو جائے کہ ماسوائی خیالات و وسواس آن کی آن میں نیست ہوتے جائیں یہاں تک کہ حواسِ خمسہ کا باطنی کردار فطرتِ صحیحہ کے تابع ہو جائے۔ آنِ حق کی نگہبانی میں تسخیرِ حواس کا ہی مقام جہادِ زندگی میں انسانیت کا "نشانِ حیدری" ہے۔

آداب و اقسامِ ذکر

کلمہ کا ذکر نفی اثبات یارانِ طریقت کے حلقہ میں بھی کیا جاتا ہے اور الگ طور پر بحالتِ خلوت اور طریقت کی حالتِ خاص میں بھی۔ محفلِ طریقت میں شمولیت کے نتیجہ میں ذکر کے مسائل و فضائل، آداب و

اقسام اور ہر قسم کے ذکر کے لئے مستعملہ انداز کا عملاً پتہ چلتا ہے۔ لہذا طریقت کے حلقوں میں وقتاً فوقتاً شمولیت ضروری ہے۔ خلوت یا جلوت کے اوقات کے دوران طریقت کی حالت خاص میں ہونے والا ذکر باقاعدہ اہتمام اور طے شدہ پروگرام کے مطابق عمل پذیر ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں ذکر کے لئے طریقت کے اصولوں کی پاسداری بہت ضروری ہے اور اس امر کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ سالک با وضو حالت میں ہو۔ وضو ذکر کے لئے لازمی شرط نہیں لیکن آداب طریقت سے متعلق ہے۔ ذکر کی حالتِ خاص میں دو زانوں یا چار زانوں پوزیشن میں بیٹھا جاتا ہے۔ ضربی ذکر کے لئے دو زانوں حالت زیادہ موزوں ہے۔ لیکن اگر بامر مجبوری چار زانوں حالت میں بیٹھا جائے تو بائیں گھٹنے کے نیچے والی رگ کو دائیں پاؤں کے انگوٹھے اور ساتھ والی انگلی کے درمیان رکھ کر گرفت میں کر لیا جاتا ہے۔ اس طرح سے ذکر اور مراقبہ کے دوران خطرات شیطانیہ پر کافی حد تک کنٹرول ہو جاتا ہے اور یکسوئی بہتر طور سے قائم رہتی ہے۔ کلمہ کے ذکر نفی اثبات کا طریقہ از روئے طریقت اصلاً ایک ہی ہے لیکن معمولِ ظاہری کی تفریق کے اعتبار سے اس کی درج ذیل چار بڑی اقسام ہیں۔

(۱)۔ **ذکرِ جہر (ضربی)** صوفیانہ طریقت کے مطابق یہ ذکر بلند آواز میں ضربی انداز سے کیا جاتا ہے۔ ذکر کا یہ طریقہ ہمہ وقتی حالت میں نہیں اپنایا جاتا بلکہ یہ ذکر کی حالتِ خاص کا معمول ہے۔ اس ذکر کے لئے دو زانوں یا چار زانوں حالت میں بیٹھ کر تصورِ شیخ کرتے ہوئے پہلے درود و سلام کا معمول سرانجام دیا جاتا ہے۔ پھر مرشد کے تصور میں "لَا اِلٰہَ" کے الفاظ

آواز میں دہراتے ہوئے سر کو بائیں سے دائیں جانب حرکت دی جاتی ہے اور ان الفاظ میں ماسوائی مقامات کی نفی کی جاتی ہے۔ لفظ "لا" سے بائیں گھٹنے کے مقام کی نفی کی جاتی ہے جو خطرات نفسانیہ کا مظہر ہے۔ اور لفظ "اِلٰہ" میں آخری حرف "ہُ" کا صوتی تلفظ با قاعدہ "زبر" کے ساتھ ادا کرتے ہوئے سر کو پیچھے کی جانب جھٹکا دیا جاتا ہے۔ اس طرزِ عمل سے کندھوں پر کے مقامات دخطرات ملکوتی کی نفی ہوتی ہے۔ پھر "اِلَّا اللہ" کا ذکر کرتے ہوئے لفظ "اِلَّا" سے قلب کے اوپر ضرب لگائی جاتی ہے اور "اَللہ" کا لفظ دہراتے ہوئے آئینہ قلب میں حق کے اثبات کی جاتی ہے۔ لفظ "اَللہ" کے آخری حصہ "ہُ" میں اس حرف کی "پیش" کا ردِعمل قلب کی عمیق ترین گہرائیوں میں ہونا زیادہ مناسب حال ہے۔ اس طرح "مقامِ ھُوْ" سے بتدریج رابطہ استوار ہوتا جاتا ہے۔ سالک کو کلمہ کی نفی اثبات کا ذکر الفاظ کے مکمل اعراب کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے صحیح تلفظ کے ساتھ کرنا ہوتا ہے۔ شیخ کے تصور میں ذکر جاری رکھتے ہوئے "لا اِلٰہ" کے الفاظ تک مع شیخ ہر شئے کی نفی کرنا پڑتی ہے۔ ہر وسوسہ، ہر فکر اور ہر خیال کو معدوم تصور کرنا پڑتا ہے اور "اِلَّا اللہ" کے الفاظ میں "اِلَّا" کی ضرب قلب کے عین اوپر لگائی جاتی ہے جس کے نتیجہ میں تصورِ شیخ کے انوار حق کی اثبات میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

(نوٹ):۔ تصورِ شیخ اس لئے کرنا ہے کہ حسنِ مطلق کا تصور حواسِ ظاہری سے ممکن ہی نہیں۔ لیکن نفی ماسوا میں خود شیخ کی حیثیت شخصی بھی شامل ہے ورنہ معاملہ شرک تک پہنچ جاتا ہے۔ اور طریقت میں شرکِ جلی اور شرکِ خفی کا تو ذکر ہی کیا خیالِ شرک بھی تمام ریاضتوں اور مجاہدوں کو غیر مؤثر بنا دیتا ہے۔ واضح رہے کہ نفی مطلق کے بعد جو اثبات ہوتی ہے وہی اثبات کامل ہے۔

(۲) - ذکرِ خفی (ضربی) اِس ذکر میں وہی آداب اپنائے جاتے ہیں جو ذکر جہر کے لئے لازمی ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ یہ ذکر زبان کی بجائے سانس کے ساتھ بذریعہ سانس ادا کیا جاتا ہے۔ سانس اندر کھینچتے وقت "لَا اِلٰہَ" اور سانس باہر نکالتے وقت "اِلَّا اللہُ" کے الفاظ دہرائے جاتے ہیں۔ اور مقامات کی نفی اثبات میں سر کو ویسے ہی حرکت دی جاتی ہے جیسا کہ ذکر جہر میں۔ اگر خلوت میں بیٹھے ہوئے یا حلقہ طریقت کی بجائے اکیلے بیٹھ کر ذکر کرنا مقصود ہو تو اِس ذکر کا معمول ذکر جہر کی نسبت زیادہ مستحسن تصور کیا جاتا ہے۔

(۳) - **ذکرِ حبسِ دم** تصورِ شیخ میں کیا جانے والا یہ ذکر زبان اور سانس کی بجائے حواس بند کر کے خیال کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ دونوں ہاتھوں کے انگوٹھوں سے دونوں کان اور ہاتھوں کی انگلیوں سے ناک منہ اور آنکھیں مکمل طور پر بند کر لی جاتی ہیں۔ سانس اچھی طرح اندر کھینچ کر روک لیا جاتا ہے اور مقامات کی نفی اثبات میں خیال ہی خیال سے ذکر شروع کیا جاتا ہے۔ اِس ذکر میں ذکرِ جہر اور خفی (ضربی) کی طرح بظاہر سر کو حرکت نہیں دی جاتی اور نہ ہی سر کی حرکت سے "اِلَّا" کی ضرب قلب پر لگائی جاتی ہے لیکن نفی اثبات اور "اِلَّا" کی ضرب کا تصور ویسے ہی قائم رکھنا ہوتا ہے۔ جتنی دیر تک سانس روکا جا سکے ذکر جاری رکھا جاتا ہے۔ جب سانس روکنا دشوار ہو جائے تو "اِلَّا اللہُ" کے الفاظ کے خیال میں سانس باہر نکال لیا جاتا ہے۔ بعد ازاں پھر سانس اندر کی طرف کھینچ کر یہی معمول اپنایا جاتا ہے۔ ذکر کے اِس طریقہ کی مزید تفصیلات صوفیا کی محفلوں سے عملاً مل سکتی ہیں۔ نفس کو محصور کرنے والا یہ ذکر جامع الانوار، باعثِ تجلیات اور

دافع الانقباض ہے جس کی بابت مولانا رومی نے فرمایا ہے۔

چشم بند و گوش بند و لب ببند
گر نہ بینی نور حق بر من بخند

(۲) **ذکر پاسِ انفاس** تصورِ شیخ کے ساتھ سانس کی آمد و رفت میں جاری رکھا جانے والا یہ ذکر اہلِ حال سالکین اور عارفین کی ہمہ وقتی روحانی غذا ہے۔ اس ذکر کو سانس کے ساتھ منطبق کرنے کے لئے ہمہ وقتی حالت میں جاری رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ عشق حقیقی اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ پاس انفاس میں کوئی دراڑ نہ پیدا نہ ہو اور ذکر سانس کے ساتھ پیوست ہو جائے۔ یہ ذکر نفس کی جملہ ریاکاریوں کی بیخ کنی کرتا ہے اور عبادت میں دکھاوے کی قطعی گنجائش باقی نہیں چھوڑتا۔ اس ذکر میں بھی ذکر خفی کی طرح سانس اندر کی طرف کھینچتے وقت "لَآ اِلٰہ" اور سانس باہر نکالتے وقت "اِلَّا اللّٰہ" کے الفاظ بذریعہ سانس ہی دہرائے جاتے ہیں۔ اس ذکر میں ماسوائی مقامات کی نفی کرتے ہوئے اور "اِلَّا" کی ضرب قلب پر لگاتے ہوئے سر کو ذکر خفی ضربی کی طرح بظاہر حرکت نہیں دی جاتی مگر باطنی طور پر وہی تصور و احساس ملحوظ خاطر ہوتا ہے۔ عبورِ منازل میں جہد اور اکتسابِ عرفان کے معاملہ میں یہ ذکر جملہ اذکار سے زیادہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔

درودِ پاک اور ذکر درودِ پاک اور ذکر کا خصوصی طور پر باہمی تعلق ہے طریقت کی حالتِ خاص میں ہونے والے ہر ذکر سے پہلے اور آخر میں درودِ پاک کا ورد لازمی ہے۔ علاوہ ازیں ذکر کی حالتِ عام میں بھی اس کا وِرد مفید رہتا ہے۔ ذکر سے قبل درودِ پاک کے وِرد کا واضح اثر یہ ہوتا ہے کہ اس کے طفیل تصورِ شیخ میں بخوبی تقویت حاصل

ہوتی ہے ۔ جسم باطنی طور پر نرم ہو جاتا ہے اور خضوع و خشوع اچھی طرح قائم ہوتا ہے ۔ جسم پر تصورِ شیخ طاری ہونے میں تقویت ملتی ہے اور تصفیہ قلب کے حصول میں پیش آنے والی کئی باطنی دشواریوں کا از خود ازالہ ہو جاتا ہے ۔

قربت الٰہی کے حصول میں درودِ پاک کا وِرد ایک وسیلہ ہے جس سے سرِمو انحراف نہیں کیا جا سکتا ۔ راہ سلوک میں پیش آمدہ ہر مشکل کے موقع پر کثرت سے درودِ پاک کا وِرد سالکین کا معمول ہے مطالعہ کُتب دِین کی روشنی میں اہلِ ظواہر اس کے متعدد فضائل سے آشنا ہیں اور کتاب وجود کا مطالعہ کرنے والے اہلِ حال حضرات اس کی متعدد برکات کی بچشم باطن مشاہدہ عینی کرتے ہیں ۔ یہ وِرد عاجزی کا بہترین طریق اظہار اور بے شمار ظاہری باطنی مشکلات کا عقدہ کشا ہے ۔

نفی اثبات اور اسم ذات کا تعلق

کلمہ کی نفی اثبات کا ذکر ترتیب الفاظ کے اعتبار سے اس قدر جامع اور مکمل ذکر ہے کہ جہد سے متعلقہ جملہ منازلِ سلوک میں متروک العمل نہیں ہو سکتا ۔ ذکرِ اسم ذات اپنے لفظ کے اعتبار سے بلاشبہ عظیم ذکر ہے کیونکہ لفظ " اللہ " کے ذکر سے کوئی بڑا ذکر نہیں چنانچہ حدیثِ پاک میں کلمہ کے ذکر کو جس میں اِسم ذات کا ذکر از خود شامل ہے افضل الذکر کہا گیا ہے ۔

عالم عنصری میں حق کی قوتوں کے ساتھ نفسانی اور شیطانی قوتوں کی کشمکش جاری ہے ۔ اس صورتِ حال کا عکس اہلِ سلوک کی باطنی کائنات میں نمایاں طور پر واضح ہوتا ہے ۔ چنانچہ حق کی اثبات سے قبل " لا " کی تلوار

سے ماسوائی قوتوں کا قلع قمع لازمی امر ہے تاکہ "فانی" کی فنا کے بعد "باقی" کی بقا کا ادراک ہو سکے۔ سالک حیاتِ عنصری میں فی الحقیقت مامور ہے نہ کہ امر، البتہ یہ الگ بات ہے کہ وہ جہد و اکتساب کے ساتھ ساتھ امر سے ہم آہنگ ہوتا جاتا ہے۔ لہٰذا حیاتِ عنصری میں مقاصدِ فطرت کی تکمیل کے پیشِ نظر ذکرِ نفی اثبات جس کی ترتیب الفاظ میں اسم ذات بھی از خود شامل ہے اصلاً اور بحیثیتِ اجتماع مناسبِ حال ذکر ہے بایں ہمہ دوسری جانب یہ معاملہ بھی اپنے مقام پر بجا اور درست ہے کہ طریقت کے بعض حلقوں میں اسمِ ذات کے ذکر کا ہمہ وقتی اعادہ بھی مروج ہے۔ لیکن نفی اثبات میں رواں دواں سالکین کے لئے مقاماتِ سلوک کے کسی بھی مقام پر نفی اثبات کے ہمہ وقتی اعادہ کو متروک العمل قرار دینا اور اس کی بجائے ذکرِ اسمِ ذات کو ہمہ وقتی حالت میں الگ طور سے بطورِ معمول اپنائے رکھنا مناسبِ حال نہیں۔ البتہ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ کلمہ کی نفی اثبات میں رواں دواں ہے سالکین کی طرف سے مختلف اوقات میں مخصوص و محدود وقفوں کے لئے اسمِ ذات کا ذکر کیا جاتا مستحسن اصولِ طریقت اور مفید مطلب ہے۔

کلمہ کے ذکرِ نفی اثبات میں مسلسل جہد کے نتیجہ میں ایک فطری اور جامع اصول کے تحت سالک کا رابطہ "مقامِ ھو" سے بتدریج پیوستہ ہوتا جاتا ہے اور عارفین کے قول کے مطابق ایک ایسا مقام بھی آجاتا ہے جبکہ سالک بدستور نفی اثبات میں رواں دواں ہوتا ہے لیکن قلب و روح خود کار مشین کی طرح ذکرِ اسمِ ذات میں محو

معلوم ہوتے ہیں ۔ ذکرِ اسم ذات فی الحقیقت قلبی اور روحی ذکر ہے لیکن کلمہ کا ذکر نفی اثبات ایسا جامع ذکر ہے جسے حیاتِ عنصری میں ہر وقتی معمول کے طور پر اپنائے رکھنا بالکل مناسب حال ہے۔ اس ذکر کا خاصا ہے کہ یہ قلب و روح کو اسم ذات کے ذکر سے آشنا کرتا ہے ۔

٭ ٭ ٭

خواہشات کا ایندھن

خواہشات ابنِ آدم کی نفسانی فطرت کی عکاسی کرتی ہے اور ان کی مقناطیسی کشش بنی آدم کو اکثر اوقات انسانیت سے بہت زیادہ دور لے جاتی ہے۔ سالک کو راہِ سلوک میں سب سے زیادہ خواہشات کی افواج سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ خواہشات کے اس ایندھن پر جس میں ابنِ آدم مسلسل جل رہا ہے مختلف نقطہ ہائے نظر سے تبصرہ کیا جائے۔

متصوفانہ نفسیاتی تجزیہ

حدیثِ پاک کی روشنی میں ہر نومولود بچے کے معصوم ہونے کا ثبوت ملتا ہے جس کے اعتقادات و کردار کی بعد ازاں تشکیل اس کے والدین کی تربیت اور اس کے ماحول اور سوسائٹی کے مطابق ہوتی ہے۔ روحِ انسانی ایک جوہرِ بسیط ہے جبکہ نفسِ انسانی ایک ایسا جوہر ہے جو اپنی اصل کے اعتبار سے نہ تو کثیف ہے نہ لطیف۔ مگر یہ جوہر اربعہ عناصر کے تقاضوں کے پیشِ نظر حیاتِ عنصری میں کثافت پذیر ہے کیونکہ حواسِ خمسہ کے ذرائع سے ماسوا کی کثافتوں کا مواد اس کے

گرد جمع ہوتا رہتا ہے۔ نفسِ انسانی میں ماسوائی کثافتوں کا دخول اور وجود ہی انواع و اقسام کی خواہشات کو جنم دیتا ہے اور نفسانی انانیت مختلف جاندار مخلوقاتی صفات سے متشکل ہوتی ہے۔ یہی کثافتیں نفسانی انانیت کے چراغ کے لئے تیل کا کام دیتی ہیں۔ اور اس چراغ کے شعلہ سے رنگا رنگ خواہشات کی شعاعیں پھوٹتی رہتی ہیں۔ نفس کی یہ شکل جو کہ جامع انکشافات اور سرچشمۂ خواہشات ہے عرفِ عام میں نفسِ امارہ کہلاتی ہے۔

ایک قدرتی طرزِ عمل کے تحت نفسِ انسانی میں خواہشات کا ایک ایسا وسیع سومنات قائم ہے جس میں ان گنت خواہشات کے بت بنتے ٹوٹتے اور نت نئی شکلیں اختیار کرتے رہتے ہیں۔ ہر خواہش نئی خواہش کو جنم دیتی ہے اور ایک خواہش کی نفی سے کئی دیگر خواہشات تغیر پذیر ہو کر نئے رنگ میں ابھرتی ہیں۔ گویا صیادِ نفس انسان کی آنِ اطاعت کو نت نئے دامِ فریب میں مبتلا کرنے میں کوشاں رہتا ہے۔ نفس کے کارخانہ میں ایک ایسی سائنٹیفک تنظیم قائم ہے کہ ایک خواہش کی تکمیل سے کئی مردہ خواہشات میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے اور کئی ضعیف خواہشات میں بے پناہ قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کے برعکس ذکر و فکر میں ایک خواہش کی نفی کے نتیجہ میں اُس سے متعلقہ اس کی متعدد ذیلی اور ضمنی خواہشات مہلک تپِ دق کا شکار ہو جاتی ہیں۔

مذہبی اور تاریخی نقطہ نظر نفسِ انسانی میں خواہشات کے اس جہنم زار کو اگر سوزِ حقیقت کے آنسوؤں سے سرد نہ کیا جائے تو اس کا "نعرۂ ھَلْ مِنْ مَّزِیْد" تاحیات ختم نہیں ہونے پاتا اور قرآن کے

بکشاف "اَلْہٰکُمُ التَّکَاثُرُ حَتّٰی زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ" (التکاثر ۲-۱)
کی عملی تفسیر چشمِ بینا کے سامنے آجاتی ہے۔ انسانی تاریخ میں خواہشات کی پوجا ہر دور میں ہوتی رہی۔ روئے زمین پر پہلا ظلمِ عظیم یعنی انسان کے ہاتھوں انسان کا قتلِ ناحق نفسانی خواہش کا ہی ردِ عمل تھا۔ سرزمینِ حق انسانی خون سے داغدار ہو گئی۔ دنیا میں فسق و فجور اور فتنہ و فساد کا بازار گرم ہوتا گیا یہاں تک کہ ابنِ آدم کی نفسانی خواہشات نقطۂ عروج کو پہنچ گئیں۔ آج کی دنیا تو اِن بتانِ کفر و شرک کا سومنات بنی ہوئی ہے اور یہ حقیقت بلاشبہ قابلِ تسلیم ہے کہ بالخصوص موجودہ دور میں خواہشات کی پیروی اور پرستش سے انسان کی زندہ و تابندہ آن یعنی آنِ اطاعت و نیابت کا حلیہ بگڑ چکا ہے اور انسان "احسنِ تقویم" کے مقام سے تنزل پذیر ہو کر اسفل سافلین کے تحت الثریٰ میں گرتا جا رہا ہے۔

سے چار سو اک تماشا بپا ہے ——— "زندگی" موت میں مبتلا ہے

مسلم مفکرین اور صوفیائے عظام تو در کنار غیر مسلم مذاہب کے مصلحین اور پیشواؤں نے بھی خواہشاتِ نفسانیہ کی پیروی اور پرستش کو انسانی تباہی کا پیشِ خیمہ اور فتنہ و فساد کا موجب قرار دیا۔ مقلدین کی تعداد کے لحاظ سے دنیا کے ایک عظیم مذہب کے راہنما گوتم بدھ نے تو بالخصوص اپنی تمام تر تعلیمات میں خواہشات نفسانیہ کی پیروی کی انتہائی مخالفت کی اور اپنی عمر بھر کے مشاہدات مجاہدہ اور تپسیہ کا یہی نچوڑ پیش کیا کہ دنیا میں تمام تر مصائب و آلام نفسانی خواہشات کی پرستش کا ردِ عمل ہیں۔ ہمیں غیر مسلم مفکرین و مصلحین کے افکار و اقوال سے کوئی سروکار نہیں مگر نفسانی خواہشات کی پیروی سے پیدا شدہ اس حقیقت سے بھی

انکار نہیں کہ۔

وجود اِن کا اصل البلیّات ہے یاں
بُرائی کی جڑ اِن کی بہتات ہے یاں

قرآن پاک میں بھی باری تعالیٰ نے فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَىٰ (سورۃ النساء - ۱۳۵)
کے واضح ارشاد سے خواہش نفس کے اتباع سے منع فرمایا ہے۔ فرمان نبویؐ
ہے "الدُّنیا جِیفَۃٌ وَطَالِبُهَا کِلَابٌ"۔ یعنی دنیا مردار ہے اور اس
کے طالب کتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اقتدار، اطاعت و نیابت سے
بے بہرہ اور خواہشات سے بھرپور دنیاوی زندگی ایک نہایت گھٹیا خواب
کی مانند ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں اور جو سراپا خسارے کی طرف لے جاتی
ہے۔ قرآن پاک کی کوئی آیت یا آیت کا کوئی حصہ ایسا نہیں ملتا جس میں لغوی
معنوی اصطلاحی یا تمثیلی انداز سے خواہشاتِ نفسانیہ کی حمایت کا خفیف سا
بھی اشارہ دیا گیا ہو بلکہ اس کتاب ھدیٰ میں ان کی سراپا مذمت کی گئی
ہے۔ خواہش کو معبود بنانے والے شخص کی بابت ایک جگہ کلام ربانی ہے۔
اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ (الجاثیہ - ۲۳) یعنی اے پیغمبر
پس کیا آپ نے اس شخص کی حالت دیکھی جس نے اپنی خواہش کو معبود
بنا رکھا ہے"

خواہشات کی پرستش بلاشبہ انسان کو "فَلَا تُعْبُدُوْا" کے
مقام پر لے جاتی ہے اور انہیں معبود بنا لینا شرک ہے۔ یہ ایک ایسا ظلم
عظیم ہے جس کے تحت انسانی تاریخ میں نہ صرف لاکھوں خاندان تباہ ہوئے
بلکہ بے شمار قومیں بھی صفحۂ ہستی سے بے نشان ہو گئیں۔

صوفیانہ نقطۂ نظر | صوفیا کے نزدیک ہر قسم کی کج فکری، جاہ طلبی،

تن آسانی، من مانی، بے راہ روی، خود پسندی، کبر و غرور، فسق و فجور، ظلم، تشدد، اور حیا فراموشی کا مخزن اور سرچشمہ نفسِ امارہ ہے۔ اسی نے انسانیت کو مُردہ تابوت بنا رکھا ہے۔ جسم انسانی کا یہ نمرودِ اعظم نفی اثبات کی چھینکوں سے بن آئی موت مر جاتا ہے اور سالک حیاتِ عنصری میں ہی "مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا" کی عملی تفسیر بن جاتا ہے۔ صُوفیا اور فقرا جملہ خواہشات کی نفی کرتے ہیں۔ اِن کے نزدیک اصلاً کوئی بھی خواہش قابلِ تقلید نہیں اور نہ ہی "انسانِ خالص" کے مقام میں کوئی وہم و وسوسہ یا خوف کی گنجائش ہے۔ عاشق سالک کی عبادت نہ تو جنت کے لالچ میں ہوتی ہے اور نہ ہی دوزخ کے خوف سے۔ حضرت رابعہ بصریؒ ایک دُعا میں اللہ تعالےٰ سے یُوں خطاب کرتی ہیں۔ "اگر میں تیری عبادت جہنم کے ڈر سے کرتی ہوں تو مجھے جہنم کی آگ میں ڈال دے۔ اگر میں تیری عبادت جنت کے لالچ میں کرتی ہُوں تو مجھے ہمیشہ کے لئے اِسس سے محروم کر دے۔ اور اے مالک! اگر میں تیری عبادت صرف تیری محبت میں کرتی ہُوں تو مجھے اپنے جمالِ ازلی سے محروم نہ رکھنا۔"

حصولِ جنت کے تصور میں عبادت کرنے والے شخص کا مقصودِ حیات جنت ہے جو خود مخلوق ہے۔ عاشق اسے بھی راہ سلوک میں شرک تصور کرتا ہے اور جنت اور حُور و قصور کے تصور سے بے نیاز رہتا ہے۔ دوسری جانب دوزخ کے خوف سے عبادت کرنے والے اور آگ کے ڈر سے شر سے بچنے والے شخص کے نفس میں ایک خفیف سا مکر پوشیدہ رہتا ہے۔ نفس کے مکر کی اسس کیفیت کا اگر گہرائی سے مشاہدہ کیا جائے تو اسس کا مدعا بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ اگر عبادت سے غافل اور شر میں محو

رہنے کی صورت میں آتشِ جہنم کی للکار نہ ہوتی تو یہ ضرور اپنی فطری سرکشی پر قائم رہتا۔ گویا اس نفسانی کیفیت میں مبتلا ہو کر عبادت کرنے والے زاہد کو یوں محسوس ہو گا کہ اطاعت اُس پر مسلط کی گئی ہے۔ اس کی مثال پرائمری کلاس کے اُس طفلِ مکتب کی سی ہے جو ہمیشہ اُستاد کی سزا سے خوف زدہ ہو کر روزانہ سبق یاد کرتا ہو۔ عاشق سالک کی عبادت اور اس کا ہر عمل فی الحقیقت احکامِ خداوندی کی اطاعت میں ہوتا ہے جس میں اُس کی کسی خواہش کو دخل نہیں ہوتا۔ جب حضرت آدم علیہ السلام نے شجرِ ممنوعہ کا پھل کھایا تو اُن کے نفسانی اوصاف زندہ ہو گئے۔ خواہش کا بیج نفس انسانی میں اُسی وقت سے قائم ہے اور یہی نوع انسان میں اس کی آبیاری حواسِ خمسہ کے ذرائع سے ہو رہی ہے۔ اس بیج کی آبیاری نہ ہونے کی صورت میں اس کی فنا کے امکانات بدستور موجود ہیں۔ اس کی فنا سے ابدی انسانیت اجاگر ہوتی ہے بعینہٖ جیسے طبی طریقِ کار سے کسی دھات مثلاً سونا اور چاندی وغیرہ کا کشتہ مفید تیار ہوتا ہے۔ مذکورہ حواسِ خمسہ قوتِ باصرہ، قوتِ سامعہ، قوتِ لامسہ، قوتِ ذائقہ اور قوتِ شامہ پر مشتمل ہیں۔ یعنی دیکھنے، سننے، چھونے، چکھنے (کھانے) اور سونگھنے کے حواس۔ سالک کو تصورِ شیخ میں ان پانچوں حواس پر آنِ حق کی نگہبانی مسلط کرتے ہوئے خواہشات کی نفی کرنا پڑتی ہے۔

خواہشات کی اقسام

(۱)۔ **خواہشاتِ نفسانیہ** | یہ خواہشات مطلقاً نفس انسانی کے تقاضوں

کی ترجمانی کرتی ہیں۔ فسق و فجور، خود غرضی، خود پسندی، عیش مستی، کاہلی، تن آسانی، جاہ طلبی، مفاد پرستی، خمار جوئی، حق تلفی اور لذات کی ہوس ان کے چیدہ چیدہ نکات ہیں۔ ان خواہشات سے مغلوب ہو کر ابنِ آدم بڑے بڑے گھناؤنے جرائم کا ارتکاب کرتا ہے اور ان کی تکمیل میں بعض اوقات ہر حربہ استعمال کرتا ہے۔ نفس پرست افراد کی سیہ کاریوں سے بھرپور تاریخ انسانی ان خواہشات کی تفسیرِ ناطق ہے۔ یہ خواہشات کبائر کی جڑ ثابت ہوتی ہیں اور ان کی تشریح ہر صاحبِ عقل و علم پر واضح ہے۔

(۲) **خواہشاتِ شیطانیہ** یہ وہ خواہشات ہیں جو ابنِ آدم کو بغیر کسی منفعت یا مفاد کے شر و فتنہ پر آمادہ کرتی ہیں۔ "افساد لا بغیری"، ناروا غصہ، حسد، بغض، کینہ پروری اور فتنہ انگیزی ان کے خاص شاہکار ہیں۔ ان خواہشات کا آلۂ کار شخص ان کی تکمیل میں نہ کوئی فوری مفاد حاصل کر سکتا ہے اور نہ انجام کار۔ ذاتی مفاد کے تصور کے بغیر دوسروں کی ایذا رسانی اس کا مطمحِ نظر ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ حسد و بغض کی وجہ سے دوسروں کو نقصان پہنچانے میں اپنے متوقع نقصان کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔ اس کی مثال اُس حاسد کسان کی طرح ہے جو پڑوسی کسان کے کھلیان کو آگ لگاتا ہوا خود اُس میں جل جائے۔

(۳) **خواہشاتِ انسانیہ** قلبِ انسانی سے اٹھنے والے جذبات کے نتیجہ میں ایسی خواہشات بھی پیدا ہوتی ہیں جن کا شمار خواہشاتِ انسانیہ کے زمرہ میں ہوتا ہے۔ یہ خواہشات کسی مقام پر وقوع پذیر ہونے والے مظالم یا حادثات کے خلاف صدائے احتجاج اور جہد کی علمبردار ہوتی ہیں اور

دفعِ فتنہ، ردِ مصائب اور حق و انصاف کی بالادستی کا تقاضا کرتی ہیں۔
اِن کا مطمحِ نظر حق پروری، حصولِ انصاف اور قیامِ امن ہوتا ہے۔
یہ خواہشات پیدا ہوتے ہی مقاصدِ اولیٰ میں ضم ہونے کی متقاضی ہوتی ہیں
اگر انسان ان کے نقطۂ نظر پر عملی جامہ پہنا سکتا ہو تو یہ اس کا انسانی فریضہ
اور احکامِ ربانی کی تعمیل کا مشن ہوگا اور خواہش کا مقام باقی نہ ہوگا۔
لیکن ایسا کم سکتے ہیں اگر کوئی انفرادی و گروہی یا زمانی و مکانی معذوریاں
ہوں یا قانونِ فطرت کے تحت کسی ایسے پیش آمدہ سانحہ کا کوئی توڑ نہ
ہو لو یہی خواہش پیدا ہو کہ ایسا سانحہ نہ ہوتا یا مستقبل میں ایسے
واقعات رونما نہ ہوں تو یہ انسانی خواہش ہوگی جو فی الحقیقت تسلیم و
رضا میں ضم ہونے کا تقاضا کرتی ہے لیکن ایسی تسلیم و رضا جو حرکت و
عمل کے نئے زاویوں کی طرحدار ہو ــــ مجاہد عارفین ایسی خواہش
کو گلے نہیں لگاتے۔ بلکہ اُن کی نگاہ اِن واقعات کے محرکات کی تلاش
میں فی الفور ایسے مقام پر جا پہنچتی ہے جہاں انہیں انکشاف ہوتا ہے۔
کہ رونما ہونے والے قریباً جملہ مصائب و مظالم اور فتنہ پردازیاں ابنِ آدم
کی نفسانی اور شیطانی من مانیوں کا ردِعمل ہیں۔ لہٰذا وہ وقتی خواہش کی
نفی کر کے ایسے محرکات کو ہٹانے میں مصروفِ عمل رہتے ہیں جو مستقبل میں
مزید فتنہ پردازیوں اور مصائبِ انسانی کا سبب بننے والے ہوں اور
جن کے مابعد وقوع پذیر ہونے سے کئی خواہشاتِ انسانیہ کے سسکتے
رہنے کا معلق اندیشہ ہو۔
خواہشاتِ انسانیہ کی ایک اور قسم کسی انسان کے اُن جذبات کے
ردِعمل سے نمودار ہوتی ہے جو کسی شخص کی زبوں حالی، بے چارگی،

مالی پریشانی یا مصائب و امراض کے موقع پر ہمدردانہ رنگ میں بیدار ہوتے ہیں یا الفاظ کی شکل میں منتقل ہو کر دعائیہ انداز میں زبان سے ادا ہوتے ہیں۔ اولیائے کرام اور پارسا حضرات کی طرف سے کی جانے والی دعائیں اسی زمرہ میں شامل ہیں۔ یہ خواہشات دردِ دل کی ترجمانی کرتی ہیں اور بالآخر مقاصدِ اولیٰ اور مشیت محیط میں ضم ہو جاتی ہیں۔ حاصل کلام یہ کہ انسانی خواہشات قلب انسانی سے اٹھنے والے ہمدردانہ، مشفقانہ، عادلانہ اور امن پسندانہ جذبات کی لہروں کا اظہار ہیں اور یہ باقاعدہ عمل کا تقاضا کرتی ہیں۔ ہر اہلِ دل روئے زمین پر فتنہ پردازی کا خاتمہ حق و صداقت کی بالادستی اور جملہ انسانی اقدار کا انفرادی اور اجتماعی تحفظ چاہتا ہے۔ ایسی خواہشات فی الحقیقت کسی عظیم تر مقصد کا ذریعہ ہوتی ہیں جو کہ فرائض کی بجاآوری اور مقاصدِ اولیٰ میں ضم ہو کر شہادت پذیر ہو جاتی ہیں یا بعض اوقات تسلیم و رضا کی لپیٹ میں آ کر نفی ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا عشق حقیقی میں کوئی بھی خواہش ایسی نہیں جسے بقائے دوام حاصل ہو۔

یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ کر دینا نہایت ضروری ہے کہ خواہشات اور حاجات کے درمیان فطرت کے میزان صحیحہ کے تحت واضح تفریق موجود ہے۔ زمینی زندگی بسر کرنے کے لئے واقعی کچھ فطری حاجات اور بنیادی ضروریات ہیں۔ فطری حاجات اور مقاصدِ اولیٰ اپنی اصل کے اعتبار سے فطرت صحیحہ کے تابع ہیں۔ سالک کا اکتساب حلال کے تحت اعتدالی یا اعتدال سے قدرے کم خورد و نوش سیرت نبوی کے اتباع میں ہے اور "کُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا" کی روشن تعمیل ہے۔ اس فطری ضرورت کی تکمیل کے بعد سالک کو عباداتی امور کی انجام دہی کیلئے توانائی

حاصل ہوتی ہے۔اسی طرح رفع حاجت، رات کو مناسب آرام، اپنے اور اپنے اہل و عیال کی تن پوشی کے لئے مناسب لباس اور گرمی سردی دھوپ اور بارش سے بچاؤ کے لئے مکان، یہ سب چیزیں فطری ضروریات میں شامل ہیں۔ یہ خواہشات نہیں۔ بلکہ انسان کی فطری اور بنیادی حاجات ہیں ۔۔ اہلِ سلوک کو ان کی تکمیل باری تعالیٰ کی مشیت کے اتباع میں کرنا پڑتی ہے۔ مگر تکمیلِ حاجات کا ہمہ وقتی مالیخولیا ذہن میں نہیں بٹھایا جاتا۔ ورنہ حاجات کی بعض اقسام بھی خواہشات کے زمرہ میں شامل ہو جاتی ہیں۔

غیر متوازن اور ہمہ وقتی استغراق، دُنیا و مافیہا سے قطعی لاتعلقی، جسمانی تقاضوں سے بے نیازی، ترکِ حواس، قطع احساس۔ سکر مقیم اور زبان بندی، اس قسم کے طویل المیعاد مجاہدات سے نفسانی خواہشات مُردہ تو ہو جاتی ہیں لیکن ان کا نفی شدہ ہر ایک نیا رنگ دکھاتا ہے اس غیر فطری طریقِ کار سے خواہشات کی موت کے ساتھ ہی کیف و مستی اور سرور کی ایسی بے پناہ لذت پیدا ہوتی ہے جو دنیا و مافیہا کی کسی بھی چیز میں نہیں پائی جاتی۔ ذکر و فکر میں یہ لذت ایسے مجاہدات میں مبتلا انسان کی ہمہ وقتی غذا بن جاتی ہے۔ نتیجتہً اکثر ایسے حضرات تا عمر خلافت کا مشن پورا کرنے سے سبکدوش رہتے ہیں اور مخلوقِ خدا کی نمایاں خدمت میں حصہ نہیں لے سکتے۔ یہ محض فنا کا مقام ہے اور ترکِ خواہشات کے اس غیر فطری اور رہبانی طریقِ کار میں وصال کا تصور نہیں ملتا۔ وصالِ حقیقی کی نعمت فنائیت کے ساتھ ساتھ جملہ عباداتی امور کی انجام دہی اور مخلوقِ خدا کی خدمت میں

نصیب ہوتی ہے جو فنا سے از خود بقا کی طرف لے جاتی ہے۔ عارفین کے نزدیک ہمہ وقتی استغراق بلاشبہ راہِ سلوک کا جزوِ لاینفک ہے، بمصداقِ قرآن ۔ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا (۸ -) مگر اس کے ساتھ ہی جملہ عباداتی امور عائد شدہ ذمہ داریوں اور فرائضِ منصبی کی انجام دہی بھی ہر آن اور ہر حال میں لازمی ہے ۔ اس دو طرفہ طرزِ عمل سے سالک میں روحانی مستی کی بجائے تڑپ پیدا ہوتی ہے اور سرور حد سے متجاوز نہیں ہوتا ۔ بلکہ اس کی نسبت سوز کہیں زیادہ بیدار ہوتا ہے ۔ حیاتِ عنصری میں ملنے والا یہی سوز عارفین کے نزدیک سرمایۂ حیات ہے ۔

وجودِ انسانی کے اجزائے ترکیبی کا تہہ بتہہ تجزیہ اور مشاہدہ کرنے سے عارفین کی نگاہ ایک ایسے مقام پر جا پہنچتی ہے جو گفتار و کردار، افکار و اطوار، سفر و حضر، قماش و معاش، سیاست و ثقافت اور ہر نقل و حرکت میں برہانِ الٰہیہ ہے ۔ خواہش تو درکنار جہاں ہر خیال اور ہر وسوسہ زِ موت بلکہ "موت" کو بھی موت ہے ۔ یہی مقام جہادِ زندگی میں انسانیت کا "نشانِ حیدر" اور "نفسِ مطمئنہ" کا " اصل مقام " ہے ۔ یہی "انسانِ خالص" کا مقام ہے جس کی جانب سالکین کی دوڑ جاری ہوتی ہے ۔ اس مقام کے ساتھ کوئی بھی خواہش قائم بالذات نہیں ۔

(۴) **ہاضم خواہش** ذکر و فکر میں انہماک اور عباداتی امور کی انجام دہی سے نفسِ انسانی بے پناہ گھٹن کا شکار ہو جاتا ہے اور "لا" کی تلوار بعد بامقصد قید مصروفیات سے کئی خواہشات کی نفی ہوتی رہتی ہے ۔ لیکن مذکورہ صورتِ حال میں ایسا اتفاق ہونا بھی خارج از امکان نہیں کہ نفی شدہ خواہشات کا جوہر سمٹ کر کسی ایک آدھ خواہش میں منتقل ہوتا جائے اور اُس خواہش

کی نفی کی طرف اہل سلوک کی توجہ قائم نہ رہے۔ اس زمرہ میں آنے والی کسی خواہش کو ہاضم خواہش کہا جاتا ہے جو دیگر کئی خواہشات کو ہضم کرتی ہے اور ان کے مردہ یا نیم مردہ جوہر سے اپنی قوت بحال رکھتی ہے۔ زیادہ مصروفیات میں مبتلا رہنے والے یا مجذوبی طبع کے بعض سالک حضرات اس خواہش کا عادتاً اتباع کرتے ہیں۔ سگرٹ حقہ نسوار یا چائے میں سے کسی ایک آدھ شئے کا بکثرت اور بے محابہ استعمال یا کسی بڑی خواہش کی نفی کرتے ہوئے کسی چھوٹی خواہش کی تکمیل سے نفسانی بے قراری کو تسکین دینے کا عمل اس خواہش کے زمرہ میں شامل ہے۔ عارفین کے نزدیک اس خواہش کی حیثیت گولی کی سی ہے جو کمزور ہاضمہ رکھنے والے کسی شخص کے لئے خوراک ہضم کرنے میں تو مدد دیتی ہے مگر خود دیر سے ہضم ہوتی ہے۔ بہرحال راہ سلوک میں اس خواہش کی بھی لازماً نفی درکار ہے۔ سراپا مجذوبوں کے زمرہ میں بعض مجذوب حضرات بھی عادتاً اسی خواہش کا اتباع کرتے ہیں۔ نفسانی خواہشات کی بے تکے انداز سے نفی کرنے کی وجہ سے نفس میں بے قراری اور تلخی پیدا ہو جاتی ہے اور اسی کی تسکین ہوتی ہیں یہ حضرات اکثر اوقات منشیات وغیرہ بھی عادی ہو جاتے ہیں۔

عارفین کا نظریہ ہے کہ ہاضم خواہش کی نفی میں سالک کو انتہائی جہد کی ضرورت درپیش ہوتی ہے اور انجام کار یہ خواہش نفی ہو کر اشتغالِ حسنہ میں ضم ہو جاتی ہے۔ اشتغالِ حسنہ فقر کی موج سے متعلق ہیں جو باطنی افکار کے حسنِ ربط و نظم، طبیعت کے حسنِ صحت اور ظاہری کردار کے حسنِ سیرت کے قیام و بقا میں معاون ثابت ہوتے ہیں مگر تضیعِ اوقات اور حالتِ غفلت سے ان کا کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔

خواہشات کی نفی کا فطری انداز

سطور بالا میں یہ نکتہ واضح کیا جاچکا ہے کہ راہِ سلوک میں ہر خواہش کی نفی کرنا پڑتی ہے ۔ انسانی خواہشات مقاصدِ اولیٰ میں ضم ہو جاتی ہیں لیکن نفسانی اور شیطانی خواہشات پر قابو پانے اور ان کی نفی کے لئے حیاتِ عنصری میں مسلسل جہد کی ضرورت ہے حضرت بو علی قلندرؒ کا قول ہے کہ "زندگی نفس کے خلاف مسلسل جہاد کا نام ہے ۔" خانقاہوں میں چلہ کشی ہو یا صحراؤں میں فاقہ کشی، پنجگانہ نماز ہو یا تہجد کے نوافل، دِن صیام میں گزارے جائیں یا راتیں قیام میں، طریقتِ صدیقیؓ ہو یا عدلِ فاروقیؓ، عجزِ عثمانی ہو یا سخاوتِ علوی، فقرِ ابوذری ہو یا عشقِ اویسیؒ عبادت کے ہر میدان میں انجام کار مقصودِ اصلاحِ نفس ہے ۔ نسبت روحانی اور نفی اثبات نفس کی بے مہار خواہشات کے سدباب کے لئے نسخۂ کیمیاء کی حیثیت رکھتے ہیں ۔

تاریخ شاہد ہے کہ مسلم مفکرین اور صوفیائے عظام کے علاوہ دیگر مذاہب کے مصلحین اور پیشواؤں نے بھی نفسانی خواہشات کی شدید مخالفت کی ۔ ہندو فلسفہ یوگ اور دھیان گیان نے دنیا سے قطعی کنارہ کشی کو خواہشات کی نفی کی بنیاد قرار دیا ۔ ہندومت میں مجاہدوں اور تپسیہ کا انجام کار مقصود حصولِ نرِوان اور فنائے محض ہے ۔ اس مذہب کے مجاذوں پیشواؤں اور مصلحین کے نزدیک دُنیا مصائب اور آلام کا گھر ہے ۔ یہ اپنی انفرادی نجات کے تصور میں خواہشات کے سانپ کو بے ڈھنگے انداز سے کچلتے ہیں ۔ یعنی سانپ

ضرور مر جائے لاٹھی ٹوٹتی ہے تو بے شک ٹوٹے کیونکہ سانپ مارنے کے علاوہ لاٹھی کا اور کوئی کام نہیں۔ اور اگر سانپ مارنے سے پہلے ہی لاٹھی خود ٹوٹ جائے تو نفس امارہ کا یہی سانپ انہیں بقول ان کے آواگون کے چکر میں ڈالتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس اسلامی تصوف کا نظریہ ترکِ خواہشات عین فطری انداز پر مبنی ہے۔ مسلم عارفین کا نظریہ ہے کہ نفس کا سانپ بھی مر جائے اور فرائض کی لاٹھی بھی نہ ٹوٹے کیونکہ اسلامی تصوف فعال ہونے کی حیثیت سے داخلی جہاد سے خارجی جہاد کی طرف لے جاتا ہے اور نگاہِ حق نما اور عصائے لا الٰہ سے طاغوتی طاقتوں کا قلع قمع کرتا ہے۔ یہ مسلمہ امر ہے کہ کائنات میں ایسی مخلوقاتی قوتیں بھی ہیں جن کی فطرت میں سراپا سرکشی ہے اور وہ خالقِ کائنات کی قوت سے مرعوب اور متاثر ہو کر ناچار جھکتی ہیں۔ ارشادِ ربانی ہے۔ وَلِلّٰہِ یَسْجُدُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ کَرْھًا (الرعد - ۱۵) یعنی زمین و آسمان کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کے آگے چار و ناچار جھکتی ہے۔ نگاہِ حق نما کے کمال کے بعد ایسی قوتوں کے قلع قمع کے لئے عصائے لا الٰہ مومن کا دوسرا جلالی ہتھیار ہے۔

مسلم عارفین کے نزدیک محض رہبانی مجذوبیت کے طریق کار سے خواہشات کی درست نفی نہیں ہوتی بلکہ ایسی صورت میں نفی شدہ خواہشات کا جوہر کسی ہاضم خواہش میں منتقل ہو جاتا ہے۔ تارکِ دنیا اور رہبانی درویش و مجذوب حضرات عادتاً اس خواہش کا اتباع کرتے رہتے ہیں۔ منشیات وغیرہ کا استعمال اور رقصا کی لذت ان کا شیوۂ حیات ہو جاتا ہے اور وہ عملی طور پر فرائضِ خلافت میں ناکام ثابت ہوتے ہیں۔ حقیقتِ حال یہ ہے کہ اجتماعی معاشرتی زندگی میں خواہشات کے جملہ امکانات کے ماحول میں رہ کر ان کی نفی کرنا بہتر ہے

طریق کار ہے۔ اس طرز عمل سے انجام پذیر ہونے والی نفی میں نہ صرف خواہشات ختم ہو جاتی ہیں بلکہ وجود انسانی میں ان کا نفی شدہ جوہر اور مواد بھی نیست ہوتا جاتا ہے۔ مثبت مصروفیات سے بھرپور اور کاروبارِ حیات سے بہرہ ور معاشرتی زندگی میں قدم قدم پر دامے درمے قدمے سخنے اور نگاہے لغزشوں کا امکان ہوتا ہے۔ خارجی ماحول اور گردوپیش کے حالات کی آزمائش پر پورا اترنا بہت بڑی ریاضت اور مجاہدہ ہے۔ حواسِ خمسہ کے ذرائع سے ظاہر اور باطن کا آپس میں بہت گہرا تعلق ہے اور انتقالِ وسواس و جذبات کے اصول کے تحت ایک شخصیت دوسری شخصیت کی صحبت نشینی سے متاثر ہوتی ہے۔

؎ صحبت طالح ترا طالح کند
صحبت صالح ترا صالح کند

اگر کوئی فرد معاشرتی زندگی اور فرائضِ انسانی سے سبکدوش ہو کر رہبانی مجذوبیت اختیار کر لے اور ذکر و فکر میں ہی مستغرق رہے تو خارجی ماحول سے پیدا ہونے والی خواہشات کے دروازے اس کے لئے کافی حد تک بند ہو جاتے ہیں۔ اس کی خواہشات غیر فطری طریق ریاضت سے انجام کار مردہ ہو سکتی ہیں۔ لیکن ان خواہشات کے جراثیم بے جان ہو جانے کے باوجود نیست نہیں ہوتے حالانکہ ان کی فنا اور اُن کا استخراج بھی لازمی ہے۔

اسلامی تصوّف کی روشنی میں اہلِ سلوک کے لئے جملہ عباداتی امور پر مبنی مکمل معاشرتی زندگی بسر کرنا لازمی ہے۔ دینِ فطرت کے سنہری اصولوں سے معمور زندگی میں قدم قدم پر نفسانی خواہشات از خود ابھرتی ہیں اور "لا" کی تلوار سے ان کی نفی ہوتی جاتی ہے۔ خواہشات کا بھی ایک وجود

بے وجود ہوتا ہے۔ انسان کی باطنی کائنات میں ان کا وجود اور ظاہری دنیا میں ان کا مقصود ہے۔ وجود کا مقصود کے ساتھ بہت گہرا تعلق ہے حرکت وعمل کی زندگی میں ذکر و فکر میں محو سالک پر حواسِ خمسہ کے ذریعے سے جب کوئی آزمائش آتی ہے تو خواہشات کے جراثیم نفس کے تہہ خانوں سے فوراً ابھرتے ہیں اور آناً فاناً خواہشات کی معروف صورت میں ارتقاء پذیر ہوتے ہوئے وجدان کی طرف بڑھتے ہیں۔ اگر وجدان پر تصورِ شیخ کی نگہبانی ہو تو ذکر و فکر میں "لا" کی تلوار سے کٹ جاتے ہیں۔ نکر دینے والے عناصر اپنی غذا اور شکار کے لالچ میں پوشیدہ مقامات سے ابھر کر از خود فریب خوردہ ہو جاتے ہیں۔ اور خواہشات کی معروف صورت اختیار کرنے ہی فنا پذیر ہو جاتے ہیں۔ دینِ اسلام کی پیش کردہ فطری زندگی میں "خَیْرُ الْاُمُورِ اَوْسَطُھَا" کا یہی طریقہ مروج ہے۔ خواہشات کی نفی کا یہ فطری طریقِ کار نہایت ہی متوازن، صحت مند اور صبر آزما ہے۔

❖ ❖ ❖

نفس کے جراثیم

قرآنِ حکیم کی روشنی میں سالک کو معرفت الٰہی کے حصول کے لئے بنیادی طور پر اپنے آپ میں غور کرنے کی تلقین ملتی ہے۔ بقولہٖ تعالیٰ "وَفِیْٓ اَنْفُسِكُمْ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ○ (الذّٰریٰت-۲۱) قولِ حضرت علیؓ کے مطابق بھی اس حقیقت سے پردہ کشائی ہوتی ہے کہ نفس کی پہچان سے رب کی پہچان ہوتی ہے۔ نفسِ انسانی کی اتھاہ گہرائیوں میں وجود بے وجود رکھنے والے ایسے جراثیم ہیں۔ جن سے لاتعداد خواہشات جنم لیتی ہیں جو ابنِ آدم کے لئے اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ بنی ہوئی ہے۔ نفس میں خواہشات کے بُتکدہ کی بنیاد انہی جراثیم پر قائم ہے۔ یہ جراثیم کسی نہ کسی صورت میں دوئی کا سبب بنتے ہیں اور بسا اوقات دوئی کی صورتِ قبیح ابنِ آدم کو ضَلَالًا بَعِیْدًا کے مقام پر لے جاتی ہے۔ ان جراثیم کی نفی نہ کرنے کی صورت میں نفسِ انسانی میں لاشعوری طور پر ان کی آبیاری ہوتی رہتی ہے اور باغاتِ نفس میں بڑے بڑے اشجارِ ممنوعہ نشوو ارتقاء پاتے ہیں۔ لہٰذا راہِ سلوک میں بنیادی طور پر ان کی نفی کی مسلسل کوشش مطلوب ہے۔ ذیل میں ایسے چار جراثیم اجمالاً تبصرہ کیا جاتا ہے۔

جرثومہ خمار | یہ جرثومہ خفیف ترین نشہ کی حیثیت رکھتا ہے جو کہ ہر قسم

کی لذات جوئی کی اساس ہے۔ اس کی بدولت نفس میں خود غرضی، حق تلفی، مفاد پروری، تن آسانی، لذائذ جوئی اور لطف اندوزی وغیرہ کے مذموم جذبات و وساوس پیدا ہوتے۔ امور شر اور حالت غفلت سے اس کی خاص نسبت ہے لیکن بعض اوقات شکر و عجز کا احساس غائب یا کم ہونے کی صورت میں امور خیر بھی اس کے اثرات سے قطعی پاک نہیں رہ سکتے۔ حیات عنصری کی مختلف حالتوں پر حاوی ہونے کے اعتبار سے متذکرہ خفیف نشہ کئی اقسام کا ہو سکتا ہے۔ مثلاً دنیاوی عزت، امارت، اثر و رسوخ یا عہدہ کا خمار، شہرت اور علم کا خمار، اولادِ نرینہ کا خمار، حسب و نسب اور پدرم سلطان بود کا خمار، کسی نشہ آور شے کے استعمال کا خمار، دوسروں سے فضول مذاق میں محویت، ہرزہ سرائی اور قطعی فضول گفتگو کا خمار، تضیع اوقات، کام چھوڑ کر بیکار بیٹھے رہنے اور یاد الٰہی سے غفلت کا خمار، ظواہر کے فانی حسن و کشش کا اثر، اشیائے خوردنی کے تصرف میں لذت کے پہلو سے ملنے والا خمار، ناکردنی، ناگفتنی، نادیدنی اور ناشنیدنی امور سے عدم گریز کا حظ اور ان کی جانب رغبت کا خمار وغیرہ راہ سلوک میں ہر قسم کے نفسانی خمار کی نفی لازم ہے۔

جبر تومہ وقار

یہ جبر تومہ نفس کی آن نمرودی کا مظہر ہے۔ نفس میں اس کی تابانی کا نقطہ عروج کفر، ابوجہلی، ہٹ دھرمی اور "اَنَا وَلَا غَیْرِی" کا مقام جہل ہے۔ اسی جبر تومہ کی بدولت فرسودہ رسومات پروری، بے جا رکھ رکھاؤ، تصنع پر مبنی ظاہر داری، نفسانی تکبر، جاہ طلبی، خود پسندی، حکمرانی، من مانی، اپنی بڑائی کا لوہا منوانے اور جبر و تشدد وغیرہ کے وساوس و جذبات ابھرتے ہیں۔ انہی وساوس و جذبات کی ترقی یافتہ شکل درندگانہ

خواہشات میں منتقل ہوتی ہے اور کئی عظیم فتنوں اور سیہ کاریوں کی موجب ثابت ہوتی ہے۔ اسی جرثومہ کی وجہ سے نفس انسانی "فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا" (النساء - ۱۳۹) اور "لَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِى الْمُلْكِ" (بنی اسرائیل - ۱۱۱) کے حقائق سے غافل ہے۔

جرثومہ تلبیس نفس انسانی میں یہ جرثومہ حسد، بغض اور کینہ کا نقطۂ نار ہے۔ یہ جملہ شیطانی خواہشات کو جنم دیتا ہے اور بعض اوقات جرثومہ خمار سے باہمی اختلاط کے نتیجہ میں حرص، ہوس، لالچ اور تکاثر کے جذبات و وسواس کو بیدار کرتا ہے جن کی ارتقائی شکل بڑی فتنہ انگیز اور مذموم خواہشات کا سبب بنتی ہے۔

جرثومہ اضطرار یہ جرثومہ نفس کے لئے وبال ہے۔ اس کی بدولت نفس کا خاموش سا مطالبہ یہ ہوتا ہے کہ حیاتِ عنصری کے جملہ امور کسی تکلیف اور محنت کے بغیر آپ سے آپ سرانجام پاتے جائیں۔ اس جرثومہ کی وجہ سے نفس "لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى" (النجم - ۳۹) کے حقائق سے غافل ہوتا ہے۔ نفس کی سرشت میں اس کے کئی پہلو ہیں۔ مثلاً عائد شدہ ذمہ داریوں اور فرائض کی کماحقہٗ انجام دہی میں اضطرار اور گھبراہٹ، صرف جائز ذرائع سے اکتسابِ رزق کی بندش میں گھبراہٹ نیز ناکامی، مایوسی، محرومیت، نامرادی اور پیچیدہ و ناسازگار حالات میں پیدا ہونے والی گھبراہٹ وغیرہ۔ ایسے حالات میں اس جرثومہ کی نسبت جرثومہ خمار سے منقطع ہوجانے کی صورت میں اکثر اوقات دفار اور پیش کے جرثوموں سے اتصال پذیر ہوتی ہے جس کے نتیجہ میں نفس میں سستی، کاہلی، تن آسانی، کام چوری، حرام خوری، محنت کے بغیر اکتسابِ رزق، فرائض ناشناسی، عدم انصاف، لاپرواہی، لاابالی پن اور دیگر کئی اقسام کے وسواس و جذبات ابھرتے ہیں اور اسی جرثومہ

کا اچانک جرثومہ خمار سے دوبارہ اتصال قائم ہو جاتا ہے۔ جس سے باطنی افکار کے نقطۂ نظر میں لذات جوئی کی حس دوبارہ قوت پذیر ہوتی ہے۔ جرثومہ اضطرار کے ساتھ "خمار" کے عدم اتصال کی حالت میں "وقار" اور "تپش" کے اختلاط سے صدمۂ نقصان، صدمۂ اموات اور خوفِ غیر اللہ کے جذبات بھی بیدار ہوتے ہیں۔ نفس میں چاروں جرثوموں کے باہمی اتصال اور عدم اتصال کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور ایسے ایسے جذبات و وسواس ظہور پذیر ہوتے جن کی وضاحت حد عقل و بیان سے باہر ہے۔ انہی وسواس کا ارتقاء ان گنت خواہشات کی صورت میں معرض وجود میں آتا ہے اور خواہشات کی ارتقائی صورت سے کبائر کا ارتکاب ہوتا ہے۔

اربعہ جراثیم کی نفی مذکرہ جراثیم کی نفی پر تبصرہ کرتے ہوئے سب سے پہلے اس امر کی وضاحت کر دینا اشد ضروری ہے کہ محض عقلی بلوغت کے بڑے سے بڑے مقام پر ذہنی رسائی حاصل ہونے کے باوجود ان جراثیم کی نفی نہیں ہو سکتی کیونکہ عقل کی حیلہ فروشی اور مدعا طلبی ختم نہیں ہونے پاتی۔ عقل نفس کی شاطرانہ چالوں سے نجات دلانے سے قاصر ہے۔ اس کٹھن ترین مشن کی تکمیل میں جہد کے لئے حقیقی عشق درکار ہے۔ مرشد کامل کی نگاہ کیمیا ساز اہلِ طلب کے من کی دنیا میں عشق حقیقی کی ایسی آتش فروزاں کرتی ہے جس کی بدولت اس کٹھن ترین جہاد کے مشن کا آغاز ہوتا ہے۔

مذکرہ چاروں جراثیم نفسانی انانیت کے مظہر ہیں۔ بہتر ہے کہ یہ "کچھ نہیں" پر مبنی تصور کئے جائیں کیونکہ ان کی بے وجودی حیثیت حقیقتِ باطلہ پر مشتمل ہے۔ "کچھ نہیں" اور حقیقت باطلہ کی مزید توضیح کیلئے عالم شہادت میں آدمی کے ساتھ اسکے سایہ کی مثال پیشِ نظر ہو جو وجود بے وجود کا حامل ہے۔ کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی ہوتا ہے اور ہونے ہوئے بھی کچھ نہیں ہوتا۔ اسلامی طریقت

کی رو سے متذکرہ جراثیم کی نفی کے لئے تصورِ شیخ میں کیا جانے والا ذکر نفی اثبات فطری طور پر نسخۂ کیمیا ثابت ہوتا ہے۔ شیخ کامل کی اجازت سے ہونے والا یہ ذکر افضل نفسانی کثافتوں کی اصل الاصول کی بجد جہد بیخ کنی کرتا جاتا ہے یہاں تک کہ "وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ" کی حقیقت آئینہ حال میں واشگاف ہوتی ہے۔ سالک کو اس سوچ کی قطعی ضرورت نہیں ہوتی کہ متذکرہ جراثیم کی نفی میں کس حد تک کامیابی ہوگی کیونکہ یہ حال کا مابعد معاملہ ہے جو سوچ کی بجائے عمل کا متقاضی ہے۔

ذکر و فکر میں مسلسل جہد کے نتیجہ میں "لا" کی تلوار سے اربعہ جراثیم کی حیثیت کا جوہر نیست ہوتا جاتا ہے۔ "نفسانیت" مرتی جاتی ہے اور خالص "انسانیت" زندہ ہوتی جاتی ہے۔ نیز مکرر نفی سے یہ جرثومے اعلیٰ و ارفع رنگ میں منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ جرثومہ "خمار" کی نفی سے تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں روحانی سرور حاصل ہوتا ہے۔ جرثومہ "وقار" کی حیثیت کی نفی ہونے پر آنِ انسانی اور غیرتِ فقر بیدار ہوتی ہے جو کہ انسانیت کا اصل وقار ہے۔ اسی طرح جرثومہ تپش اور جرثومہ اضطرار ہر دو کی نفی کے نتیجہ میں حقیقی سوز و تڑپ کا حصول ہوتا ہے۔ بعض اوقات "اضطرار" کے جرثومہ کی نفی شدہ صورت گھٹن میں تبدیل ہو جاتی ہے جس سے نفس کمزور ہوتا جاتا ہے۔ چاروں جرثوموں کی اجتماعی نفی میں جہد کا ایسا ردِ عمل ہوتا ہے جس کی صحیح عکاسی احاطۂ بیان سے باہر ہے۔ اہلِ سلوک کو متذکرہ عمل کے ہر ردِ عمل سے بے نیاز ہو کر اپنے مشن میں رواں دواں رہنا پڑتا ہے۔

متذکرہ جراثیم نفسانی انانیت کی مسجد ضرار کے بنیادی ستون ہیں۔ سالکین کو ان کی نفی کے لئے انتہائی جہد کی ضرورت درپیش ہوتی ہے۔ باطنی طور پر

ہمہ وقتی ذکر و فکر جاری ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی نفی کا متوازن ترین راستہ اسلامی طرزِ حیات اور اتباعِ سُنت ہے۔ راہِ سلوک کا یہ طرزِ طریقت "خالص انسانیت" کی طرف مسلسل رجوع ہے اور آنِ مرشدینہ میں محمدیت کی طرف مسلسل کشش اس کا مقصودِ حیات ہے۔ اسلامی طریقت سے ہٹ کر رہبانی مجذوبیت کا طریقہ اختیار کرنا اور ترکِ فرائض، ترکِ حواس اور قطعِ احساس سے ہمہ وقتی گم گشتگی اختیار کر لینا بالکل بے اعتدالی کا طریقہ کار ہے۔ اس تجاہلِ عارفانہ میں مبتلا ہونے والے مجذوب حضرات دنیاوی لذات سے بے نیاز ہونے کے باوجود ایک بہت بڑی لذت میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور نتیجۃً فرائضِ خلافت کی سرانجام دہی سے محروم رہتے ہیں۔ یہ لذتِ ذکر ہے جو تمام لذات کی قاطع اور ہر شے سے بے نیاز کر دینے والی چیز ہے۔ رہبانی مجذوبیت کے طریقِ عمل سے نفی کی صورت میں جرثومہِ خمار سرور کی انتہائی شکل مستی میں تبدیل ہو جاتا ہے اور جرثومہِ اضطرار تڑپ میں منتقل ہونے کے ساتھ ساتھ بے حس ناکارگی کو جنم دیتا ہے۔ یہ ناکارگی نفس کا ایسا فریب ہے جس کا احساس اور ادراک حالت میں اکثر اوقات مردہ ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس سالکانہ انسانی کردار اور عبادانی امور میں مصروفیات ایسے عوامل ہیں جو ذکر کی آتشِ لذت کو ساتھ ساتھ سرد کرتے رہتے ہیں اور سالک ذکر کی لذت سے آشنا ہونے کے باوجود اس میں گرفتار نہیں ہوتا۔ جس قدر کوئی سالک دنیاوی سطح پر زیادہ انعام یافتہ ہو اسی قدر اسے خمار اور وقار کے جرثوموں کی نفی میں زیادہ کٹھن مجاہدہ کی ضرورت درپیش ہوتی ہے اور حسنِ اخلاق اور عجز و انکساری کا تصور قائم رکھنا پڑتا ہے بعینہٖ جیسے درخت کی پھلدار شاخ زیادہ جھکتی ہے۔

اربعہ جراثیم کی نفی کے لئے سالک کو فانی مرغوبات نفسانی تقاضوں، تن

آسانی اور کاہلی نیز حسد و بغض اور کینہ پروری سے کلی طور پر اپنی رغبت منقطع کرنا پڑتی ہے اور صرف ایک ہی کے مشن کے لئے وقف رہنا پڑتا ہے۔ "اَللّٰہُ وِتْرٌ وَیُحِبُّ الْوِتْرَ" (حدیث پاک)۔ (اللہ تعالیٰ ایک ہے اور صرف ایک ہی کو چاہتا ہے) نگاہِ عشق میں نفس کے کسی تقاضے کو کوئی دخل نہیں۔ مناسب خورد و نوش اور نیند کا اصل تعلق عالم عنصری میں صحت و حیات کے قیام و بقا کے ساتھ ہے۔ لذات جوئی اور عیش و آرام طلبی کی حس کے ساتھ فی الحقیقت اس کا کوئی رشتہ نہیں۔

نفسانی انانیت کے ان جڑ توڑ موت کی نفی کے لئے جو کہ خواہشات کی اصل الاصول ہیں سالک کو مرشد پاک کے تصور کے تحت اپنے حواس پر حق کی نگہبانی مسلط کرنا پڑتی ہے۔ کیونکہ حواس خمسہ کے ذریعے سے ہی خواہشات کے ان بیجوں کی آبیاری ہوتی ہے۔ شیخ کامل کا تصور برھان الہیہ اور قاطع الوساوس ہے۔ سالک کو مرشد پاک کی آنِ حق نما کے وسیلہ سے "لا" کی تلوار کے ساتھ حواس پر ایسے مؤثر انتزاع کے نفاذ کی ضرورت ہوتی ہے جس کے نتیجہ میں نفسانی وسواس و جذبات تکرر نفی ہوتے جائیں۔ سالک یہ مشکل ترین کام خود اکیلا نہیں کر سکتا بلکہ یہ آنِ حق نما کا کام ہے ــ سالک سے یہ کام کرایا جاتا ہے جس کی سرانجام دہی کے لئے اس کی طرف سے عاجزی و انکساری راہِ سلوک کا بنیادی تقاضا ہے۔ اس مقصدِ عظیم کے لئے سالکین کے دل میں عشق حقیقی کا ایسا شعلہ آتش فروزاں کیا جاتا ہے جو سوائے وحدہٗ لاشریک کے باقی ہر شئے کو جلاتا چلا جاتا ہے۔

اہل اللہ کا مقولہ ہے۔

اَلْعِشْقُ نَارٌ تُحْرِقُ كُلَّ شَيْءٍ مَّا سِوَى اللّٰهِ

عشق ایک ایسی آگ ہے جو اللہ کے ماسوا ہر شے کو جلا ڈالتی ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

استغراق و مراقبہ

تصوف میں استغراق و مراقبہ سے اصل مراد حالتِ قربت ہے جو ذکر و فکر میں خضوع و خشوع اور یکسوئی کے ذریعے سالک پر طاری ہوتی ہے۔ یہ راہِ سلوک کا جزوِ لاینفک ہے اور سالک اس سے ہرگز گریز نہیں کر سکتا۔ عارفین کے قول کے مطابق سالک اسی حالتِ قربت میں مسلسل مجاہدہ کرتے ہوئے راہِ سلوک کے ارتقائی مدارج میں داخل ہوتا ہے۔ ذکر و فکر میں خضوع و خشوع اور یکسوئی کی اہمیت کے پیشِ نظر کسی کا یہ تصور کر بیٹھنا شدید غلط فہمی ہوگی کہ انسان خلیفۃ اللہ فی الارض کے فرائض سے پہلوتہی کرتے ہوئے دُنیا و مافیہا سے ہی مکمل کنارہ کشی اختیار کر لے اور اپنے اوپر عائد شدہ جملہ انفرادی اور اجتماعی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوتے ہوئے کسی جگہ گوشہ نشین ہو کر ذکر و فکر میں ہمہ تن مستغرق ہو جائے۔ انسانی زندگی کے جملہ ظاہری و باطنی پہلوؤں پر محیط اسلامی نظامِ حیات کا بہترین منشورِ طریقت و معرفت کی رُو سے اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ سالک کی حیاتِ عنصری کے تمام تر زاویے اطاعتِ کاملہ کے محور رہیں اور ذکرِ پاسِ انفاس میں بھی کوئی دراڑ

نہ پیدا ہو۔ بمصداق قرآن "یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیٰماً وَّقُعُوْداً وَّعَلٰی جُنُوْبِہِمْ (آل عمران - ۱۹۱) یعنی اللہ تعالیٰ کے نیک بندے کھڑے ہوتے، بیٹھتے ہوئے اور کروٹیں لیتے ہوئے اُس کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ نیز وقتاً فوقتاً مراقبہ طریقت یا مراقبہ خلوت بھی ہو اور کلی استغراق بھی جبکہ عام اوقات میں ایسا متوازن استغراق طاری رہے جو طریقت کے مطابق دیدنی شنیدنی، گفتنی اور کردنی امور کی سرانجام دہی میں معاون ہو۔ عشق حقیقی کا تقاضا ہے کہ سالک کا ذکر و فکر سانس کے ساتھ منطبق ہو جائے اور سدا البہر ندی کے آب رواں کی طرح چلتا رہے۔ ذکر و فکر اور فریضۂ اطاعت و نیابت ایک گاڑی کے دو پہیوں کی طرح اپنے اپنے مدار پر چلنے کے باوجود ایک دوسرے کو تقویت دیتے ہیں۔ لیکن پیچیدہ مصروفیات، حواس گیر امورِ حیات اور عقل سلیم پر مبنی ذمہ داریوں کی سرانجام دہی میں غیر متوازن استغراق کی بجائے عین متوازن استغراق کی ضرورت ہے تاکہ فریضۂ اطاعت و نیابت کو ضعف نہ پہنچے۔ اس دو طرفہ طرزِ عبادت کے متوازی خطوط سے پیدا ہونے والا راستہ سالک کو حقیقی وصال کی منزلِ مقصود سے ہمکنار کرتا ہے۔ سالک کو حیاتِ عنصری میں قدم قدم پر ایسے امور سے دوچار ہونا پڑتا ہے، جن کی سرانجام دہی کے لئے عشق مقیم کے آئینہ میں عقل سلیم کے مدار پر چلنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر ان کردنی امور کی سرانجام دہی کے دوران سالک اپنے ہوش و حواس سے قطعی طور پر بے نیاز نہ ہو جائے اور غیر متوازن اور کلی استغراق میں محو رہے تو اس کے کئی ایسے معاملات میں خلل پیدا ہونا خارج از امکان نہیں۔ ایک سالک ذکر و فکر میں محویت اختیار کئے ہوئے استغراقی حالت میں سائیکل پر جا رہے تھے کہ

اچانک سائیکل پھسل گئی اور اُن کا بازو ٹوٹ گیا۔ یہ حادثہ وقوع پذیر ہونے والے اُن متعدد حادثات کی ادنیٰ مثال ہے جن کے نتیجہ میں کئی اہل سلوک کی خانگی ذمہ داریاں، فرائض منصبی اور تعمیری صلاحیتیں استغراق میں سرور و مستی کی لذت آفرینی کی نذر ہو گئیں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہ اخذ کیا جائے کہ اس نوع کے معاملات میں سالک کے لیئے نفسانی انانیت کا احساس قائم رکھنا ضروری ہے۔ یہ اہلِ حال کا تجرباتی اور مشاہداتی معاملہ ہے کہ انانیت کے باطنی احساس پر کئی اقسام کے وسواس و جذبات اُبھرتے ہیں جو بلاشبہ تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب میں بُری طرح حائل ہوتے ہیں۔ انہی وسواس کی ترقی یافتہ شکل کئی ناکردنی ناگفتنی، نادیدنی اور ناشنیدنی امور کے سرزد ہونے کا باعث بنتی ہے اور نوبت اُن کبائر تک جا پہنچتی ہے جو فرد کی ذات تک ہی محدود نہیں ہوتے بلکہ معاشرہ میں بڑی خرابی کا باعث بنتے ہیں کیونکہ فرد معاشرہ کی مشینری کا پرزہ ہے۔ راہ سلوک میں باطنی طور پر اپنی "نفسانی میں" کا کوئی تصور نہیں۔ لہٰذا اصل مدعائے بیان یہ ہے کہ جملہ امور کی سرانجام دہی میں سالک پر متوازن اور فعالی استغراق کی حالت طاری رہے۔ عارفین کے نزدیک نفس انسانی کی روباہ بازی، کج فکری، خود فریبی، خود پرستی، تمارجوئی اور حرص پروری کا مؤثر علاج یہی ہے کہ ہمہ وقتی استغراق میں تصورِ شیخ کے تحت اپنی "میں" کے احساس کی نفی کی جائے کیونکہ نفسانی انانیت کا احساس سراپا فتور ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب اخذ کر لینا بھی غلط فہمی ہو گی کہ انسان ہمہ وقتی حالت میں شعورِ انسانی سے بے نیاز ہو کر محوِ استغراق رہے۔ معاملہ ایسے ہرگز نہیں بلکہ آنِ انسانی کا خالص اور انفرادی شعورِ اطاعت کاملہ کا عبرت آموز اور خلافتِ فاصلہ کا بشارت افروز ہے۔ یہ انسانی اقدار کا نگہبان اور

دردِ دل کا پاسباں ہے۔ نورِ انسانیت کے اس جوہر کو طریقت کی پاسداری اور عبادانی امور کی انجام دہی میں بہت زیادہ جلا ملتی ہے۔ پیچیدہ مصروفیات اور فرائضِ منصبی کی بجا آوری کے دوران میں تقسیم توجہ کی وجہ سے سالک پر غیر متوازن استغراق کی بجائے متوازن استغراق کی کیفیت قائم رہنا لازمی ہے۔ اگر سالک ان جملہ امور کو ان کی سرانجام دہی کے دوران میں کسی مرحلہ پر ایمانا و احتسابا مقاصدِ فطرت کے خلاف تصور نہ کرے اور مرشد کے تصور میں ہو تو وہ درایں حالات محرومِ استغراق نہیں ہوتا لیکن ایسے اوقات کے دوران سالک پر اکثر و بیشتر عدمِ استغراق اور عدمِ خشوع کا وہم گزرنا بھی یقینی امر ہے جس کی فوری نفی اس کے سوز و گداز میں تقویت کا باعث بنتی ہے۔ ذکر و فکر میں اس طرزِ عمل کے مجاہدہ سے سالک کی نفسانی انانیت نہایت کڑوے انداز سے نیست ہو لی رہتی ہے اور اس کی آنِ انسانی اجاگر ہوتی جاتی ہے۔ راہِ سلوک میں اس سے زیادہ کٹھن اور کوئی چلّہ کشی نہیں۔

سالک معاشرہ اسلامی اور نسلِ انسانی کا ایک بڑا جاندار پرزہ ہے اور صُمٌّ بُکمٌ نہیں ہوتا۔ راہِ سلوک میں ضرورت اس امر کی ہے کہ قدرت کی طرف سے ودیعت کردہ جملہ نعمتوں کا تصرف مقاصدِ اولیٰ کی تکمیل میں کیا جائے۔ طریقت کے مطابق دید، شنید، کردنی اور گفتنی امور کی انجام دہی اس لئے ضروری ہے کہ قدرت کی طرف سے آنکھ کان، ہاتھ پاؤں اور زبان عطا کی گئی ہے جس سے مخلوقِ خدا کی تعمیری اور اصلاحی خدمت درکار ہے۔

مشیت ایزدی کے اتباع میں اعضائے انسانی کا یہ طرزِ عبادت راہِ سلوک میں استغراقِ معنوی کہلاتا ہے۔ صحیح لگن ہونے کی صورت میں عقلِ سلیم بھی اس

عبادت میں شامل ہے۔ عشق مقیم سے بے بہرہ عقل کا ہر درجہ ناقص ہے اور عقل سلیم وہی ہے جس کی نمود عشق مقیم کے آئینہ میں ہو۔

سالک پر عائد شدہ جملہ خانگی معاشرتی معاشی دینی اصلاحی اور تعمیری ذمہ داریاں اُسے ملکڑ کر رکھ دیتی ہیں۔ تصورِ شیخ کے تحت ان پیچیدہ مصروفیات کی بجا آوری میں اس کے نفس کو بُری طرح نکیل ڈال کر گھسیٹا جاتا ہے۔ اس فعالی استغراق میں ہونے والے مجاہدہ سے نفسانی انانیت بے پناہ گُھٹن کے تحت اندر ہی اندر چھلنی ہوتی جاتی ہے جس کے نتیجہ میں نفس کی نوحہ خوانی شروع ہو جاتی ہے۔ نفس کی یہ پکار ہوتی ہے کہ اُسے تڑپا تڑپا کر نہ مارا جائے بلکہ سیدھا سا طریقہ اپنایا جائے۔ ہر کام ترک کر کے مراقبے کئے جائیں اور ہوش ربا شعور فرسائی اور مجذوبی استغراق میں ہمہ وقتی محویت اختیار کی جائے تاکہ وہ ذکر و فکر کی لذت میں احساسِ تکلیف کے بغیر فنا ہو۔ ایسی صورتِ حال میں نفس کی کیفیت اُس دیرینہ مریض کی سی ہوتی ہے جو بیماری کی طوالت اور تکلیف کی شدت کے سبب قوتِ برداشت ختم ہو جانے پر ناچار مرنے کی دعائیں کرتا رہتا ہو اور یہ بالکل نہ سوچتا ہو کہ

ع مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

آنِ مرشدیت میں خیر الماکرین کی نمود نفس کی ان شاطرانہ چالوں سے بخوبی آگاہ ہوتی ہے۔ مرشدِ پاک کا مشن اس امر کا تقاضا نہیں کرتا کہ مسافرِ سلوکِ عشقِ حقیقی کی پُرپیچ گھاٹی میں ہمہ وقتی حالت میں ترکِ حواس قطعِ احساس اور ترکِ فرائض اختیار کرتے ہوئے آنکھیں بند کر کے چلتا جائے۔ ترکِ معاشرہ کا شیوہ اپنائے اور سکرِ مقیم اور ہوش ربا استغراق میں محو ہو کر ذکر و فکر کی لذت کا شکار ہوئے۔ اس نوع کا مجذوبی اور

رہبانی شیوہ نہ صرف اسلامی طریقت کے خلاف ہے بلکہ اصولِ معرفت کے میزانِ واصلہ پر بھی پورا نہیں اُترتا۔ دنیا و مافیہا کی تمام لذات کی قاطع ذکر و فکر کی لذت ہے جو کہ جملہ دنیاوی لذات کا بہترین نعم البدل ہے۔ مجذوب اس لذت میں فنا ہو جاتا ہے اور نتیجتاً فرائضِ خلافت سرانجام نہیں دے سکتا۔ لیکن مستغرق سالک کا مقام اس سے آگے ہے۔ وہ لذتِ ذکر سے آشنا ہونے کے باوجود اس میں گرفتار نہیں ہوتا اور اس کا نفس عبادانی امور کی سرانجام دہی کے بوجھ تلے پس پس کر مرتا ہے۔

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را
ہر زماں از غیب جانے دیگر است

ایک سالک صاحب نے ایک مجذوب کو اپنے جسم پر بہت زیادہ وزنی لوہا پہنے ہوئے دیکھ کر کہا "آپ اس قدر لوہا کس لئے پہنے ہوئے ہیں اور اتنا وزن اٹھائے ہوئے کیسے چلتے پھرتے ہیں" مجذوب صاحب نے کچھ ایسے الفاظ میں جواب دیا۔

" ہمارا یہ وزن اٹھائے رکھنا کسی حساب کے تحت ہے۔ ہمیں پیدل چل کر فلاں فلاں مزار پر حاضری دینا پڑتی ہے اور ہر حاضری کے نتیجہ میں ہمارے اس وزن کی مقدار کم ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ ہمیں یہ تمام لوہا اتار دینا ہوتا ہے لیکن جب ہمیں سالک حضرات کے شانوں پر باطنی مجاہدہ کے ساتھ ساتھ خانگی اور معاشرتی ذمہ داریوں، کٹھن فرائض اور کلمۃ اللہ کی سربلندی کا بوجھ دکھایا جاتا ہے تو ہم لوگوں کو اُن پر پڑے ہوئے وزن کے مقابلہ میں اس لوہے کا وزن کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔"

فرمانِ نبوی "کلّکم راعٍ و کلّکم مسئول عن رعیتہ" کی روشنی میں کسی صاحبِ حواس کو زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنے اوپر عائد شدہ ذمہ داریوں اور جملہ ہوش طلب امور کی انجام دہی سے گریزاں ہو کر بے ہوش رہا اور شعور فرسا استغراق میں ہمہ وقتی محویت قائم رکھے۔ صحیح الاعضا فرد پر لازم ہے کہ وہ اپنے اعضا کو تعمیری اور اصلاحی انسانی مقاصد کی تکمیل میں تصرف میں لائے۔ صاحبِ علم کے لئے ضروری ہے کہ وہ نافع علم کے ابلاغ میں بخیل نہ ہو۔ ان نعمتوں کا جائز تصرف نہ کرنا نہ صرف امانت میں خیانت ہے بلکہ ان کے استعمال سے گریزاں ہو کر محوِ استغراق رہنا راہِ سلوک میں بہت بڑے نقص کی دلیل ہے۔ قواعدِ سلوک کی رو سے اہلِ عقل و حواس کی زمرہ میں ہمہ وقتی حالت میں غیر ملوانن اور بے ہوش استغراق میں محو ہو کر بیٹھے رہنا صرف اسی شخص کو زیب دیتا ہے جو کان سے بہرہ، زبان سے گونگا، بینائی سے محروم، صحت سے معذور، علم سے کورا اور دست و پا سے اپاہج ہو لیکن ایسا شخص دنیا میں شاذ و نادر ہی کوئی ملتا ہو گا۔ علاوہ ازیں بعض سالک حضرات امورِ حیات میں مختصرات کا شیوہ اپنا کر اپنے شب و روز کا زیادہ تر حصہ کلی استغراق اور حالتِ سکر میں گزارتے ہیں۔ یہ اُن کے انفرادی حال کا معاملہ ہے جس پر تبصرہ نہیں ہو سکتا۔ البتہ اس ضمن میں اتنا واضح کر دینا ضروری ہے کہ مختصرات اور قناعت راہِ سلوک کے بنیادی معمولات میں سے ہیں اور مفید ہیں۔ یہ معمولات ترکِ خواہشات اور تخفیفِ حاجات میں تو ہو سکتے ہیں مگر ترکِ فرائض میں نہیں اپنائے جا سکتے۔ لہٰذا کسی سالک کا اپنے اوپر عائد شدہ فرائض میں از خود تخفیف کر لینا یا ذمہ داریوں سے پہلو تہی کر کے مختصرات

کا شیوہ اپنائے ہوئے بے حس ہو کر محوِ استغراق رہنا روح تصوّف کی اصل کو نہ سمجھنے کے مترادف ہے۔

استغراق و مراقبہ اور لمحاتِ فرصت | بایں ہمہ تفصیل اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ہر سالک کے شب و روز میں فطری طور پر ایسے اوقات کا گزران ہونا بھی لازمی اور یقینی امر ہے جن کے دوران میں اُسے کچھ بھی نہیں کرنا ہوتا۔ نہ کوئی تعمیری یا اصلاحی پروگرام ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی دینی فریضہ سرانجام دیا جاتا ہے۔ قطعی فرصت کے یہ لمحات رات کی خلوت میں زیادہ اور دن کی جلوت میں نسبتاً کم میسر آتے ہیں۔ یہ لمحات مصروف ترین افراد پر اُن کے شب و روز میں مسلسل یا وقفوں کے بعد کم از کم چند منٹ اور فارغ الاوقات حضرات پر چند گھنٹے ضرور رہتے ہیں اور نیند کی حالت میں بسر ہونے والے اوقات سے علاوہ ہوتے ہیں۔ یہ لمحات وقفوں کے لحاظ سے تعداد میں زیادہ ہوں یا کم ہوں، مدت کے لحاظ سے طویل ہوں یا قلیل، دن میں ہوں یا رات میں — یا دوسرے چوتھے روز میسر آئیں، ان کا بہترین مصرف یہی ہے کہ انہیں کامل یکسوئی اور مکمل سکر و استغراق میں گزارا جائے اور حقیقت کی مشاہدہ بینی کے لئے رجوع الی اللہ میں محویت اختیار کی جائے۔ بموجب ارشادِ ربانی "فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ" (الم نشرح - ۷، ۸)

عقل و شعور اور حواس و احساس کا تعلق فرائض کی سرانجام دہی، ذمہ داریوں کی بجا آوری، فطری حاجات کی تحصیل و تکمیل اور دیدنی شنیدنی کردنی اور گفتنی امور سے ہے لیکن یہ لمحات فطری طور پر ان محسوسات اور معاملات سے مستثنیٰ ہوتے ہیں۔ لہٰذا قانونِ فطرت کے مطابق عقل و حواس اور شعور و احساس کا استحقاق فی الوقت ختم ہو جاتا ہے اور قلب و روح

کا استحقاق اپنے خالص ترین رنگ میں جاگزین ہوتا ہے۔ سالک کو ان اوقات میں ہر فکر و عمل اور قیل و قال کے تمام قضیوں سے گزر جانا ہوتا ہے۔ انسانی ضابطۂ حیات کے جملہ امور کو جو فی الوقت فکری پروگراموں اور سوچوں سے وابستہ ہوں اپنے ذہن سے اتار کر ان کی صریحاً نفی کرنا ہوتی ہے۔ دین و ادب کے ہر منشور، فلسفہ کی موشگافیوں اور تصوف کے جملہ ظاہری اور باطنی مسائل کے احساس ادراک میں اپنے عجز و ناقص پن اور معاملہ ناقہمی کا احساس قائم کرنا پڑتا ہے۔ تصورِ شیخ میں گم ہو کر عقلی پرواز دل اور علمی ہمہ دانیوں کی نفی کرنا ہوتی ہے اور سالک کی طرف اس حال اور اسی خیال میں رجوع کرنا ہوتا ہے کہ "اے علیم! میں کچھ نہیں جانتا — اے حکیم! ساری حکمتیں تجھ سے ہی وابستہ ہیں۔ اے خبیر! مجھے اپنی بھی خبر نہیں۔ اے موجود! میں کچھ نہیں ......

مراقبہ کا طریقہ سالک کو اپنے قلب و ذہن میں ہر شئے اور ہر احساس کو آن کی آن میں خارج کرنے کے بعد تصورِ شیخ میں مکمل خضوع و خشوع کے ساتھ ذکر پاس انفاس جاری رکھنا ہوتا ہے۔ پھر آنکھیں بند کر کے کامل یکسوئی کے ساتھ شیخ کا تصور سامنے کیا جاتا ہے۔ اس سے قبل شیخ کو ظاہری طور پر جس جگہ، حالت یا جس لباس میں دیکھا گیا ہو اسی جگہ، حالت یا اسی لباس کی مناسبت سے اپنے اس تصور کو بخوبی تقویت ملتی ہے۔ مرشدِ پاک کا سامنے تصور جماتے وقت درود پاک کا ورد کرنا بہت ضروری اور مفید ہے۔ اسی دوران سالک کے اپنے جسم پر بھی تصورِ شیخ کی شعاعیں وارد ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ اپنے خیال کی شعاعیں مرشد پاک کے تصور میں ضم ہو جاتی ہیں۔ اور تصورِ شیخ بجد جہد اور بموجب کرم اپنے جسم پر طاری ہو جاتا ہے۔

پھر پورے جسم پر شیخ کا تصوّر تیز تر کرنے کے بعد پیشانی پر دو ابروؤں کے عین وسط میں نگاہ جمائی جاتی ہے۔ یہاں سے تصوّر کی شعاعیں سارے جسم پر پھیلتی ہیں اور یہیں سے تصوّر کے انوار جانب قلب بڑھتے ہیں۔ بعد ازاں دورانِ قلب رجوع کیا جاتا ہے جس کے نتیجہ میں قلب کی صفائی ہوتی ہے اور یہ انوار و تجلیاتِ حق سے معمور ہوتا جاتا ہے۔

مراقبہ کا متذکرہ معمول دو زانوں یا چار زانوں حالت میں بیٹھ کر اپنایا جاتا ہے۔ لیکن اگر وقت اور جگہ موافق اور معاون نہ ہوں یا وقتی حالات کے تحت کسی مصلحت کا تقاضا پیشِ نظر ہو تو اس اندازِ نشست کی کوئی قید نہیں مگر ایسی صورت میں یہ سکر و استغراق اور مراقبہ کی ایک ملی جلی شکل ہوگی۔ جن سالکین کا استغراق در مراقبہ مسلسل جہد کے نتیجہ میں زیادہ عمیق ہو جاتا ہے۔ عارفین کے قول کے مطابق اُن پر آنکھیں بند کئے بغیر مراقب اور استغراقی کیفیت وارد ہو سکتی ہے۔ استغراق و مراقبہ کا یہ مقام۔ ارشادِ ربانی۔ " فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ "(البقرہ۔ ۱۱۵) کا آئینہ حال میں مظہر ثابت ہوتا ہے۔ شب کے آخری حصہ میں بیدار ہو کر سالک کا خلوت میں کامل یکسوئی سے استغراق و مراقبہ کا معمول قائم رکھنا راہِ سلوک میں بہت زیادہ مفید ہے کیونکہ یہ نزولِ رحمت اور وصولِ انوار کے خاص اوقات ہیں۔ ان اوقات میں خارجی مداخلت نہ ہونے کی وجہ سے ذکر و فکر میں خضوع و خشوع نسبتاً زیادہ قائم رہتا ہے۔ نیز کی کوتاہیوں کا کا تدارک اور کئی خطاؤں کی معافی ہو جاتی ہے۔

تفصیلاتِ مضمون کا اجمال یہ ہے کہ عاجزو معجونہ کا رشتہ متوازن استغراق کی صورت میں ہمہ وقتی حالت میں قائم رہے اور حیاتِ عنصری کا کوئی تقاضا

فرائض کی کوئی نوعیت اور مصروفیات کا کوئی دور اس رشتہ میں حائل نہ ہو۔ عباداتی امور کی سرانجام دہی میں قائم رہنے والی مصروفیت فطری طور پر نفس کی کئی محسوساتی اور غیر محسوساتی امراض کی بیخ کنی کرتا ہے۔ لیکن دوسری جانب جب سالک کو لمحاتِ فرصت میسر ہوں تو پھر جملہ ظاہری حواس کا استحقاق ختم ہو جانے پر طلب و رشد کا استحقاق جاگزیں ہو جاتا ہے جس کا فطری تقاضا کامل یکسوئی اور مکمل استغراق و مراقبہ ہے۔ یہ وہ لمحات ہیں جب ایک کا صرف ایک سے ہی رشتہ ہوتا ہے۔

؎ فرشتہ گرچہ نگنجد قرب درگاہ
نہ گنجد در مقام "لی مع اللہ"

نوٹ:۔ طالب حق سالک سلوک و عرفان کی ذمہ داریوں کے دوش بدوش اپنی روزمرہ کی ذمہ داریاں ترک نہیں کرتا بلکہ ان کے ساتھ ہی ساتھ طلبِ حق میں محو رہتا ہے۔ قرآنِ باری تعالیٰ "وَتَبَتَّلْ اِلَیْهِ تَبْتِیْلًا (المزمل - ۸)" کے مصداق ہمہ وقتی حالت میں محوِ استغراق رہنا لازم ہے۔ استغراق کی دو حالتیں ہیں ایک حالتِ صحو اور دوسری سکر قواعدِ سلوک کے تحت دونوں حالتیں اپنے اپنے اوقات کے دوران میں طاری ہونے کی متقاضی ہیں۔

حالتِ صحو میں استغراق فعالی ہوتا ہے اور یہ حالت من حیث العمل اُن جملہ اوقات پر محیط ہونے کی متقاضی ہے جن کے دوران میں سالک کوئی نہ کوئی فریضہ انجام دیتا رہتا ہے۔ اس حالت میں ماسوائی امور سے ہٹ کر توجہ اس فریضہ میں داخل ہوتی ہے جو کہ مشیت کے تحت فی الوقت انجام پذیر ہو رہا ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ عباداتی امور اور ذمہ داریوں کی بجا آوری کے

دوران میں اہلِ سلوک پر اس حالت کا رنگ کام کی نوعیت کے اعتبار سے کبھی فی الوقت خفیف ہوتا ہے اور کبھی عمیق۔

حالتِ سکر مجذوبی استغراق ہے اور اس حالت کے طاری ہونے کا تقاضا اُن اوقات کے دوران میں بیدار ہوتا ہے جو لمحاتِ فرصت[۱] کے زمرہ میں آتے ہیں۔ یعنی وہ لمحات جن کے دوران ظاہری حواس کے کردنی، گفتنی، دیدنی اور شنیدنی امور کی بجا آوری کا فریضہ فطری طور پر بیدار نہ ہوتا ہو۔ ایسے اوقات میں عقل و حواس کا استغراق فی الوقت ختم ہو جاتا ہے اور قلب و روح کا استغراق خالص ترین رنگ میں جاگزیں ہوتا ہے۔ یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ ترکِ فرائض یا تخفیفِ فرائض کے نتیجہ میں حاصل ہونے والی خود ساختہ فراغت لمحاتِ فرصت کے زمرہ میں نہیں آتی اور ایسی حالت میں سکر کا کوئی جواز نہیں۔

⁂ ⁂ ⁂

جذب و جنون

سالکین کیلئے حیاتِ عنصری میں ایسے دور سے گزرنا بھی امکانی امر ہے جسے عرفِ عام میں جذب و جنون کہا جاتا ہے۔ جذب و جنوں کی حالت بے اختیاری اور بیخودی کے عالم پر مبنی ہوتی ہے جس میں مبتلا ہو کر سالک بعض اوقات ظواہر کے اعتبار سے معاشرتی زندگی کا ناقص پرزہ دکھائی دیتا ہے۔ اس کا ذوق و وجدان غیر معمولی تغیر کی عکاسی کرنے لگتا ہے عقل کے مدار پر عشق جاگزین ہو جاتا ہے۔ اور اس کے ظاہر اور باطن میں اعتدالِ حسنہ بمشکل قائم رہ سکتا ہے۔ سالک کبھی مقاماتِ ظلمات کی بھول بھلیوں میں کھو جاتا ہے۔ کبھی تجاہلِ عاشقانہ میں غوطہ زن ہوتا ہے اور کبھی مراحلِ عارفانہ میں داخل ہوتا ہے۔ اس کے حواسِ خمسہ کے ادراکات کی شعاعیں ایک ہی نکتہ پر مرتکز اور منجمد ہو جاتی ہیں اور باطنی کیفیات کا ورود اسے اس ڈگر پر لا ڈالتا ہے کہ معاملہ سالک کے اپنے بس میں نہیں رہتا۔ بعض سالکین پر یہ دور دنوں اور ہفتوں تک جاری رہتا ہے جبکہ بعض حضرات پر مہینوں اور سالوں تک۔ بہر حال یہ راہِ سلوک کا خوش آئند لیکن خطرناک موڑ ہے اور اہلِ جنون سالکین مالک کے خاص لطف و کرم سے ہی اس مقام کے خطرناک ردِ عمل سے بچ پاتے ہیں۔ یہاں اس امر کی وضاحت کر دینا بھی ضروری ہے کہ بعض افراد سفلی علوم، کالا علم، تسخیرِ جنات، کشف القلوب، کشف القبور اور تسخیر ہمزاد وغیرہ کے وظائف و عملیات میں الجھ کر بھی عارضی

یا مستقل طور پر ذہنی پاگل پن کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اُن کا معاملہ خارج از موضوع ہے اور راہِ سلوک میں وارد ہونے والی حالتِ جذب و جنون سے ایسے معاملات کا کوئی تعلق نہیں۔

جذب و جنون کی حالت مختلف سالکین پر اُن کے مختلف ظاہری باطنی حالات کے تحت طاری ہوتی ہے۔ یہ حالت عموماً سالک کے انفرادی ذوق و وجدان، مزاج کی انفرادی آن، جوشِ طلبِ حقیقت، عاشقانہ رنگ کے افراد، متعلقہ سلسلہ سے حصولِ فیوض کے زاویۂ نزول اور اس پر غالب ہونے والی آن، ہم شدیت کے ردِ عمل میں وقوع پذیر ہوتی ہے۔ نیز فکر میں تیزی، عمل میں کمزوری، باطنی افکار کا غیر منظم ہونا اور باطنی ابلاغِ تعلیم کا روحانی پہلو وغیرہ بھی اس کے محرکات میں سے ہو سکتے ہیں۔ کیفیت کے محرکات جو بھی ہوں بہر حال یہ کیفیت اہلِ طلب کے لئے اصلاح اور فلاح کا پیش خیمہ ہے۔ اس کیفیت کے ساتھ ماسوائی اور شیطانی عناصر کی مداخلت کا امکان بھی لازماً ہوتا ہے۔ مگر سالکین راہِ سلوک کے جس مدار سے گزرتے ہیں وہاں یہ چیزیں ــــ "کچھ نہیں" پر مبنی ہوتی ہیں۔

عارفین کے نزدیک جذب ایک عظیم نعمت ہے جس کے بغیر عرفان حاصل نہیں ہوتا۔ یہ نعمت ایک طرف صحیح قلبی سوز کا باعث بنتی ہے اور دوسری طرف سالک کی حیاتِ ثانیہ کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ لیکن یہ مشاہداتی معاملہ ہے کہ کئی سالکین پر حالتِ جذب وارد ہوتے ہی کم و بیش ہر حصہ کیلئے جذب کے ساتھ لمبا اوقات ایسے جنون کا بھی التباس ہو جاتا ہے جو ارتقاء پذیر ہو کر ظواہر کے اعتبار سے اُن کے کردار میں تناقض یا غیر شائستگی کا باعث بنتا ہے اور نتیجتاً بعض اوقات ایسے حادثات رونما ہو جاتے ہیں جو اُن کے متعلقین کے

لئے خاصی پریشانی کا سبب بنتے ہیں ۔ یہاں یہ وضاحت بھی لازمی ہوگی کہ جنون کی بھی مختلف کیفیات ہیں۔ اگر اس میں عاشقانہ رنگ کی صحت ہو، اس کے خارجی اثرات ناخوشگوار نہ ہوں اور یہ صاحب جنون سالک کے متعلقین اور غیر متعلقین کے لئے بے ضرر ہو تو ایسی صورت میں اس کی باطنی کارروائی اکتساب عرفان میں عین معاون ہے بلکہ عبور منازل کے لئے ایسے باطنی جنون کا ہونا لازمی ہے۔ لیکن کئی سالکین کو پیش آمدہ مشاہداتی معاملہ ہے کہ جنون بعض اوقات اچانک بے لگام ہو کر کاروبار حیات میں بظاہر خاصے بگاڑ کا بھی باعث بن جاتا ہے اور بے بسی کی یہ حالت روحانی چارہ جوئی کا تقاضا بیدار کرتی ہے ۔ اہل جنون سالک پر جو باطنی کیفیات گزرتی ہیں اُن کے تحت وہ بزعم خویش صحیح راہ پہ گامزن ہوتا ہے ۔ لیکن دوسری جانب مقامات و منزل اور ظاہر و باطن کے "تضادات" کا ردِ عمل بھی جاری رہتا ہے ۔ جنون کی بے لگامی اور اس کی ظاہری حالت کے ازالہ کیلئے احتیاطی معمولات کے تذکرہ سے قبل جذب و جنون کی تین معروف حالتوں اور کیفیات پر تبصرہ لازمی ہے ۔

تین حالتیں

حالتِ بے اختیاری | جذب و جنون کے دوران روحانی فیوض کا نزول وسعتِ ظرف کی نسبت زیادہ ہوتا ہے جو سالک سے سنبھالا نہیں جاسکتا نتیجتاً بے اختیاری کی حالت زیادہ طاری رہتی ہے ۔ گفتار و کردار ظاہری میں حسنِ سیرت بمشکل قائم رہتا ہے اور اکثر اوقات زبان از خود

رفتہ ہو جاتی ہے۔

حالتِ مستی ذکر و فکر میں سوز و سرور اور مستی کا قدرتاً حصول ہوتا ہے۔ اکثر اہلِ جنون سالکین کو عام حد تک سوز و سرور حاصل ہوتا ہے جبکہ ان پر کیفیت مستی حدِ اعتدال سے کہیں زیادہ طاری ہوتی ہے مستی کی لذت الٰہی بے خودی کا سبب بنتی ہے کہ سالک کی دلچسپی ذکر و فکر کے علاوہ دیگر عباداتی امور سے قائم نہیں رہتی اور وہ لذت ذکر میں مبتلا ہو کر رہ جاتا ہے۔ مستی و بے خودی کے طاری رہتے ہیں سالکین پر ایسی کیفیات بھی وارد ہوتی ہیں جو کائناتی بے ثباتی اور دنیا کے فانی ہونے کی دلیل بار بار تازہ کرتی ہیں۔ اس زاویۂ احساس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کردار و عمل کی عبادت میں اکثر اہلِ جنون کی دلچسپی کم ہو جاتی ہے۔ انہیں ہر چیز آنی فانی دکھائی دیتی ہے اور ان پر حال مستی کی کیفیت زیادہ طاری رہتی ہے۔

یہاں اس نکتہ کی وضاحت کر دینا لازمی ہے کہ ذکر و فکر میں خاص تیزی اور ذوقِ لطیف کے نتیجہ میں یا جوشِ استغراق کے ردِ عمل میں سالکین پر کسی کسی وقت طاری ہونے والی حالت وجد و مستی منفرد حیثیت کی حامل ہے۔ اس کا اثر محض وقتی اور ہیجانی اعتبار سے ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ کیفیت حالتِ مستی کی متذکرہ کیفیت کے زمرہ میں نہیں آتی۔

جسمانی تکلیف کی حالت خاص جذب و جنون میں اکثر سالکین جسمانی تکلیف کی حالت میں بھی مبتلا ہوتے ہیں لیکن خال خال سالکین پر تکلیف کی حالت خاص طاری ہوتی ہے جس میں سالک کے بال بال میں سخت چبھن اور

روح میں بے اطمینانی پیدا ہوتی ہے۔ سرور کی بجائے سوز اور مستی کی بجائے تڑپ اور بدنی تکلیف کا غلبہ زیادہ رہتا ہے۔ نیز دل و دماغ اور اعضائے جسمانی کا ہر حصہ سراپا درد ہوتا ہے۔ یہ نہایت کٹھن کیفیت ہے جس کی چارہ جوئی کے لئے دُعا اور دوا ہر دو ذرائع کا تقاضا بیدار ہوتا ہے۔

کیفیاتِ دید و شنید

جذب و جنون کی حالت میں سالکین کے جنون میں بے لگامی کا بہت بڑا سبب بننے والی دید و شنید کی باطنی کیفیات ہیں۔ یہ کیفیات بلاشبہ ہدایت اور اصلاح کا بھی ذریعہ ثابت ہوتی ہیں" لیکن خدا کی راہ میں شیطان" کے مصداق ایسی حالت میں ہدایت اکثر اوقات نہایت پُرپیچ انداز سے حاصل ہوتی ہے۔

ع ہزار لکتیں کتاب دل کی قرأت میں

سالک ابھی تن اور من کی دنیا کے درمیانی مقامات میں ہوتا ہے یہ مقامات سراپا مجاز بھی ہو سکتے ہیں اور سراپا اعجاز بھی عارفین کے نزدیک "چھپ کے مقامات" ہیں جہاں بہت کچھ دیکھا سنا جا سکتا ہے لیکن معاملہ فی الحقیقت "کچھ نہیں کی دنیا" کا مظہر ہوتا ہے۔ سالک اسی پر منزل کا گمان کرتے ہوئے جو کچھ دیکھتا اور سنتا ہے کہہ ڈالتا ہے یا اس پر عمل کر گزرتا ہے۔ اس طرز عمل کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسی باطنی کیفیات سالک میں جنون کی ظاہری بے لگامی کا سبب بنتی ہیں۔ امکانی ہی نہیں

بلکہ یقینی امر ہے کہ "کچھ نہیں" کی مجازی اور اعجازی کیفیات حقیقی اور عرفانی ہونے کا گمان دیتی ہیں۔

احتیاطی معمولات

حالتِ جذب و جنون کی ظاہری بے لگامی کے ازالہ کے لئے درج ذیل احتیاطی معمولات راہِ سلوک کے مستحسن اصول سمجھے جاتے ہیں

(۱)۔ جذب و جنون کے عالم میں سالک کے لئے اس امر کا احساس قائم کر لینا ضروری ہے کہ وہ طریقتِ اسلامیہ کے اصولوں پر پہلے کی نسبت زیادہ عمل پیرا ہو جائے اور طریقت کے ظواہر کی انتہائی پاسداری کرے کیونکہ اسلامی طریقت عقائد و افکار اور ظاہری حرکت و عمل میں بے اعتدالیوں کے خلاف ڈھال ہے۔

(۲)۔ اپنے شیخ کے آستانۂ عالیہ پر حاضری دینا اور شیخ طریقت سے بالمشافہ ملاقات کا شرف حاصل کرنا انتہائی لازمی ہے۔ بعض سالکین کے ساتھ ایسا اتفاق ہوتا بھی امکانی امر ہے کہ نفسانی اور شیطانی عناصر اُن کے ذہن میں مرشد کے خلاف بدگمانی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے وسواس کی فوری نفی مطلوب ہے۔

(۳)۔ خاص اوقات کی حالتِ بے اختیاری پر کلام نہیں لیکن عام اوقات کی بے اختیاری کی حالت کو اختیاری پر قیاس کرنا پڑتا ہے اور اس ضمن میں ہونے والی بے قاعدگیوں پر اپنے آپ کا محاسبہ لازم ہے۔

...اگر شب و روز کے عام اوقات میں کیفیت مستی طاری ہونا شروع

ہو جائے تو اس سے گریز کرنا اور اس کی نفی میں جہد کرنا لازم ہے بلکہ ہیں کیفیت کے وارد ہونے سے قبل ہی یہ احساس پختہ کر لینا بہتر ہے کہ عام اوقات میں کیفیت مستی کا کوئی جواز نہیں۔ اس اندازِ فکر کے حامل حضرات زیادہ تر قلبی سوز سے ہمکنار ہوتے ہیں۔

(۵)۔ جسمانی تکلیف کی حالت خاص نہایت ہی کٹھن مرحلہ ہے جس میں گرفتار ہونے کی صورت میں ظاہری جنون کی معمولی حالت بھی شدتِ تکلیف کے باعث کئی گنا قوی ثابت ہوتی ہے۔ لہٰذا اس کے ازالہ کے لئے دعا اور دوا ہر دو ذرائع اختیار کرنے پڑتے ہیں۔

(۶)۔ کسی بھی باطنی کیفیت کا اثر قبول نہ کیا جائے بلکہ اپنا کام جاری رکھتے ہوئے ہر کیفیت کی اس خیال سے نفی کی جائے کہ

ع خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

علاوہ ازیں باطنی کیفیات کا بے مقصد اور عام تذکرہ کرنا کسی طور سے بھی مناسب حال نہیں۔

(۷)۔ عام معاملات پر دوسروں کے ساتھ اصرار و تکرار کی عادت ختم کرنا اور کم گوئی کا شیوہ اپنانا بہت بہتر اقدام ہے لیکن کم گوئی جنون نمانہ ہو۔ کاروبارِ حیات میں دلچسپی بطور فرض برقرار رکھنا لازم ہے نیز ذمہ داریوں سے فرار کی بابت ذہن میں پیدا ہونے والا ہر خیال باطل کرنا پڑتا ہے خواہ وہ الہامی ہی کیوں نہ معلوم ہوتا ہو۔

(۸)۔ بعض سالک حضرات جن پر ابھی جذب و جنون کی کیفیت وارد نہیں ہوئی ہوتی اپنے روحانی معاملہ میں تقویت حاصل کرنے کی خاطر اپنے سلسلہ کے معمولاتِ شیخ کے علاوہ دوسرے سلاسل کے وظائف و اوراد بھی بلا اجازت

اپنا لیتے ہیں۔ اس عمل کے ارادہ کی اجازت اپنے ہی شیخ یا مرشد سے ملتی ہے خواہ ظاہر میں ملے یا باطن میں، اور ایسا کرنے کی باقاعدہ اجازت اپنے شیخ کے طفیل اس بزرگ سے حاصل ہوتی ہے جن کے سلسلہ میں مطلوبہ وِرد معمول مروّج ہو۔ اگر اپنا شیخ پردہ پوشی ہوچکا ہو تو دوسرے سلسلہ کے بزرگ سے جہاں مطلوبہ ورد مروّج ہو براہ راست بھی اجازت مل سکتی ہے۔ لیکن اس بزرگ کو اپنے ہی شیخ کے تصور میں دیکھا جاتا ہے۔ یہاں یہ نکتہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ نفی اثبات میں رواں دواں سالکین کے لئے شیخ کی طرف سے بتائے گئے معمولاتِ طریقت کے علاوہ کسی دیگر ایسے وِرد کی ضرورت نہیں ہوتی جس سے نفی اثبات متاثر ہو۔ ایسے تمام معاملات میں احتیاط نہ کرنے کی صورت میں بھی سخت جنون کی حالت طاری ہوسکتی ہے جس کا ازالہ مشکل سے ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں بعض سالکین بعض اوقات اپنے شیخ کے معمولاتِ طریقت کے ساتھ ہی ساتھ جاہلانہ تسکین ذوق کی خاطر ایسے عملیات کا معمول بھی اپنا لیتے ہیں جو راہِ سلوک کا قطعی حصہ نہیں اور نتیجتاً سخت ذہنی یا گل پن کا شکار ہوجاتے ہیں۔ راہِ سلوک میں ایسی بے قاعدگی سے گریز لازم ہے۔

(۹)۔ بیعت کے بعد ذکر و فکر میں خاصا تیز ہوجانا جبکہ خواہشات کی عملاً نفی میں نسبتاً زیادہ کمزور رہنا بے اعتدالی کا طرزِ عمل ہے۔ گو ذکر و فکر میں تیزی ایک بہت اچھا معمول ہے جو جذب و استغراق کا باعث بنتا ہے لیکن اگر خواہشات کی عملاً نفی میں اغماض برتا جائے تو ایسی صورت میں عموماً جذب کے ساتھ جنونِ بے لگام کا احتمال یقینی امر ہے اس لئے کہ سالک کے باطنی مقامات میں نفی زیادہ قائم ہوجاتی ہے

اور رجحانات نسبتاً بہت کم۔ لہذا خواہشات کی نفی کے بنیادی اصول پر شروع سے ہی عملاً گامزن ہوجانا اور اس ضمن میں جہد برقرار رکھنا مستحسن اقدام ہے تاکہ فکر و عمل میں انسانی توازن قائم ہوتا جائے۔

٭ ٭ ٭

وہم الیقین

تعریف و تعارف وہم الیقین سے مراد یقین بذریعہ وہم ہے۔ یعنی کسی فرد کا کسی بے حقیقت معاملہ کو سُنی سنائی اور غیر مصدقہ روایات اتفاقی وقوعجات یا اپنی باطنی واردات اور اوہام باطلہ یا غلط عقائد کے نتیجہ میں اس حد تک درست اور سچ سمجھ لینا کہ اس کے نزدیک وہ یقین کے زمرہ میں شامل ہو جائے۔ مذکورہ محرکات کی روشنی میں کوئی بھی شخص وہم الیقین کا شکار ہو سکتا ہے خواہ وہ متصوف ہو یا غیر متصوف۔ مگر یہاں صرف متصوف سالک کے باطنی معاملات پر تبصرہ مقصود ہے۔

یقین کے تین معروف اور بالترتیب مراحل علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین ہیں۔ لیکن راہ سلوک کے مسافر کو باقاعدہ طور پر یقین کے مجازی مرحلہ سے بھی گزرنا پڑتا ہے جسے وہ جذب و جنون کی کیفیت کے شوخ رنگ سے متاثر ہو کر حقیقی سمجھ بیٹھتا ہے۔ یہ مرحلہ وہم الیقین کا ہے جو کہ علم الیقین سے شروع ہو کر عین الیقین کے آخر تک یقین کا ایک مجازی اور متوازی پہلو ہے جو وقتاً فوقتاً ٹوٹتا جڑتا بھی رہتا ہے۔ سالک اکثر اوقات یا کبھی کبھار اس سے متاثر ہوتا ہے لیکن حالتِ جذب و جنون میں اس کیفیت کا غلبہ زیادہ رہتا ہے۔ جذب و جنون کی حالت میں اکثر سالکین یہ گمان کر بیٹھتے ہیں کہ اُن

کی منزل قریبِ تکمیل اور پرواز خاصی بلند ہو چکی ہے نیز یہ کہ انہیں زندگی کے اسرار و رموز سے آگاہ کر دیا گیا ہے۔ ایسے تصوراتِ آئینۂ معرفت پر کے زنگار کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان سے بہر صورت گریز اور ان کی نفی لازم ہے۔

پیچیدہ واردات وہم الیقین میں گرفتار ہونے والے بعض سالک حضرات کو خناسی اشغال پر مشتمل مجازی الہامات اور انکشافات ہوتے ہیں۔ بعض اوقات "کچھ نہیں پر مبنی دنیا" سے تعلق رکھنے والی اشکال مشخصہ اور کئی ماقبل دیدہ و نادیدہ افراد کے نکھرے ہوئے ہیولے بھی دکھائی دئے جا سکتے ہیں۔ جذب و جنون کے عالم میں یہ کیفیت حالتِ خواب میں بھی طاری ہو سکتی ہے۔ اور مراقبہ کی حالتِ نیم خوابی میں بھی۔ نیز مراقبۂ جلوت یعنی کھلی آنکھوں سے ہونے والے مراقبہ کی حالت میں بھی بوجہِ استغراق یہ کیفیت طاری ہو سکتی ہے۔ ایسی صورتِ حال میں اگر چشمِ باطن میں کسی ایسی شخصیت کی نمود ہو جسے قبل ازاں بچشمِ ظاہر دیکھا جا چکا ہو اور وہ متکلم ہو جائے تو بالکل امکانی امر ہے کہ اس کے اندازِ گفتار، آواز کے رنگ، نقوشِ شبیہ اور اس کی نقل و حرکت کے عام انداز میں مقامِ ظاہر سے کوئی واضح تفریق دکھائی نہ دے۔ متذکرہ طرز کی کیفیت گزرنے پر اکثر اوقات یہ گمان بحد یقین پیدا ہو سکتا ہے کہ جو کچھ دیکھا سنا جا رہا ہے بالکل درست اور صحیح ہے۔ اپنے مرشد کے علاوہ اگر کسی بھی ولی یا غیر ولی کی تصویر دکھائی دے تو اُسے "کچھ نہیں" سے تعبیر کرتے ہوئے اس کی فوری نفی کرنا ضروری ہے۔ البتہ اگر عالمِ خواب یا مراقبہ کی حالتِ نیم خوابی میں مرشد سے ملاقات ہو اور مرشد کے وسیلہ سے کسی اور بزرگ سے بھی ملاقات ہو جائے تو ایسی کیفیت کا معاملہ کچھ الگ نوعیت کا حامل ہے لیکن سالک کو بہر طور ہر مقام کی نفی کرتے ہوئے آگے بڑھنے کی ضرورت درپیش

ہوتی ہے۔

اس حقیقتِ حال سے آگاہی لازم ہے کہ متکلم نفسانی انانیت کی شعاعیں بت نئی آوازوں کا روپ دھار کر سالکین کو غلط فہمیوں کا شکار بنانے میں جہد کرتی ہیں۔ ایک سالک نے جنہیں ایک جگہ سے بیعت کئے ابھی تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا ایک محفل میں بیان کیا کہ" مجھ پر مرشد کا بڑا کرم ہے۔ باوجود اس کے کہ مجھے سلسلہ میں داخل ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا" میں "اولیائے کرام کے مزاروں پر حاضری دے کر اُن سے بحالتِ مراقبہ گفت وشنید کر لیتا ہوں" عارفین کے نزدیک یہ کیفیت اپنی ہی انانیت کی صدائے بازگشت کا دوسرا رنگ ہوتی ہے اور وہم الیقین کی ایک اعجازی کڑی ہے۔ البتہ واصل بحق عارف کا معاملہ کچھ الگ نوعیت کا حامل ہے اور اس کا اپنے مُرشد کے طفیل کسی بزرگ سے اس طرح روحانی انتساب ہو جانا اور کسی نکتہ ہدایت سے فیض یاب ہونا امکانی امر ہے جو اعجازی اور روحانی عالم سے متعلق ہے مگر یہ چپ کا مقام ہے۔

عارفین کے نزدیک حق الیقین تک رسائی حاصل ہونے سے قبل ہر حقیقت کا کوئی نہ کوئی مجاز ہوتا ہے اور تقریباً ہر مجاز میں شیطانی مداخلت سے نبرد آزما ہونا امکانی معاملہ ہے۔ سالک جن مقامات سے گزرتا ہے وہ حقیقت سے متعلق یا حقیقت نما تو ضرور ہو سکتے ہیں لیکن ان میں قدم قدم پر مجاز یا اعجاز کا رنگ دکھائی دیتا ہے۔ ہدایت بھی حاصل ہوتی ہے اور وسواس خناسی بھی ابھرتے ہیں۔ ہر ایسا کشف و القاء جس کا مواد قرآن و سُنت کے اصولوں سے متصادم ہو اس کی فوری تردید لازمی ہے خواہ وہ کتنے ہی پُر کیف انداز سے وارد ہوا ہو۔ قرآن و حدیث کے واضح احکامات کے خلاف

وارد ہونے والا کشف اور الہامی کیفیات شیطانی جال کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اگر سالک کو کسی باطنی واردات سے متعلق قرآن و حدیث خاموش معلوم ہوتے ہوں تو اُسے عموماً مرشد پاک کی طرف سے از خود باطنی تسکین حاصل ہو جاتی ہے اگر کسی نامعلوم وجہ سے اُسے قلبی تسکین حاصل نہ ہو سکے تو وہ اپنے شیخ یا کسی صاحب بصیرت اہل سلوک سے بظاہر تبادلہ خیالات کر کے نکتہ ہدایت حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن جن باطنی کیفیات سے اعتقاد و عمل کو کوئی خطرہ نہ ہو ان میں خاموشی اختیار کر لینا بہت بہتر اقدام ہے اور ان کی تشریحات جوئی ممنوع ہے۔

اہل حال حضرات کا نظریہ ہے کہ باطنی کیفیات سے حاصل ہونے والی ایسی اطلاعات جو واقعاتی اعتبار سے عملاً درست ثابت نہ ہوں یا ایسی معلومات جن کے درست یا غلط ثابت ہونے تک نوبت نہ پہنچی ہو بلکہ وہ محض وجدان پر قابض ہو کر معلوماتی لحاظ سے اپنی درستی اور سچائی کا رنگ اختیار کئے ہوئے ہوں بعض اوقات سالک کو بری طرح وہم الیقین کا شکار بنا دیتی ہیں۔ بعض سالکین انہیں صحیح کشف و الہام سے تعبیر کرنے لگتے ہیں اور یہی خیال کر بیٹھتے ہیں کہ ان کا رابطہ بجد اولی درست ہے۔ کئی سالکین کے ساتھ ایسا بھی اتفاق ہوا کہ انہیں مستقبل میں پیش آمدہ حالات کا قبل از وقت علم ہو گیا اور حالات ان کے کشف کے مطابق پیدا ہوئے۔ چنانچہ وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ وہ آئندہ بھی لازماً کشف صحیحہ سے بہرہ ور ہوتے رہیں گے۔ دوسری جانب بعض سالکین باطنی طور پر شیطانی اور خناسی مداخلت کی عملداری کے نتیجہ میں سراپا وجدان اور نگاہ کی فریب خوردگی کا بھی شکار ہوئے۔ ہر دو قسم کی باطنی کیفیات کے نتیجہ میں یہ لوگ بُری طرح وہم الیقین میں جکڑے گئے۔ شیطانی انانیت کی

خناسی قوتوں نے ایسے کئی افراد کو بڑے ذو معنی اور محیط عقل انداز بیان سے عیسٰی مہدی اور نہ جانے کیا کیا بن جانے کے ضلالت انگیز وسواس دئیے۔ حضرت شاہ عبدالشکور رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی ایک کتاب میں لکھا ہے کہ "سالک کو کسی مرحلہ پر اس امر کا انکشاف ہونا کہ "تم عیسٰی ہو" اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ باطل قوتیں اسے مرتبہ کے لحاظ سے اس ولی سے تشبیہ دے رہی ہیں جن کا نام عیسٰی تھا اور جو کشمیر میں مدفون ہیں۔ اور اس امر کا انکشاف ہونا کہ "تم مہدی ہو" اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ یہ قوتیں سالک کو از روئے مذاق مہدی بمعنی کامل ہدایت یافتہ کہہ کر پکار رہی ہیں نہ کہ امام مہدی موعود"

مقصودِ بیان اور اثبات وہم الیقین

وہم الیقین کا باب کیفیاتی اور مشاہداتی مسائل سے تعلق رکھتا ہے جس میں سفر سلوک کے خطرناک اور پیچیدہ ماحول کی عکاسی کی گئی ہے۔ اس کی تفصیلات کے بیان سے یہ مقصود نہیں کہ ایسے اشخاص کو جن کے اپنے اذہان میں ایسے ایسے گمراہ کن وسواس پیدا ہوں کہ وہ مثل عیسٰی یا مہدی موعود ہیں محض وہم الیقین میں مبتلا خیال کر کے برداشت کر لیا جائے۔ بلکہ مقصودِ بیان یہ ہے کہ اس نوع کی کیفیات میں یا تو اکثر اوقات کم و بیش ناری تپش کا تعلق موجود ہوتا ہے یا بعض اوقات قدرت کے کھیل پر مشتمل اعجازی کیفیات وارد ہوتی ہیں جو کہ باطنی ابلاغ تعلیم کا باعث بھی بنتی ہیں اور اصل حقیقت تک رسائی حاصل ہونے میں معاون بھی بشرطیکہ ایسی صورتِ حال سے دوچار ہونے پر خاموشی قائم رکھی جائے اور اس کی نفی کی جائے۔ وہم الیقین بجائے خویش کوئی منزل نہیں

بلکہ مقامات کی بھول بھلیاں ہیں جس کی نفی سے حقیقت کی جانب قدم بڑھتا ہے۔ حق الیقین تک رسائی حاصل ہونے سے قبل وہم الیقین سے گزرنا سفرِ سلوک کا خاصہ ہے۔ اس حقیقت کی نشان دہی قرآن پاک کے حوالہ سے سورۃ الانعام میں بھی ملتی ہے جبکہ ابراہیم علیہ السلام نے رات کے وقت ایک ستارہ دیکھ اور اُسے "ھٰذَا رَبِّیْ" کہہ دیا۔ لیکن جب وہ غروب ہوگیا تو آپ نے فرمایا " لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ ہ یعنی میں غروب ہوجانے والوں سے محبت نہیں رکھتا۔ پھر جب چاند کو چمکتا ہوا دیکھا تو اُسے بھی کہہ دیا" یہ میرا رب ہے" مگر اُس کے غروب ہوجانے پر اپنے قول کی تردید کی۔ پھر سورج کو چمکتا ہوا دیکھا تو اُسے بھی ھٰذَا رَبِّیْ" کہا۔ مگر جب وہ بھی غروب ہوگیا تو آپ نے اپنے قول وخیال کی پھر نفی اور تردید کی۔ یہاں تک کہ آپ پر توحید باری تعالیٰ کا راز منکشف ہوگیا اور آپ نے فرمایا" اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ہ (الانعام-۷۹) (بے شک میں اپنا رُخ اُس کی طرف کرتا ہوں جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور میں شرک کرنے والوں سے نہیں ہوں۔

ایک ضروری سوال

اس باب کے مطالعہ سے کسی اہلِ طلب کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ اگر کوئی شخص اس قسم کے دعوے کرے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری گزر رہی تھی اور آنحضورؐ نے اپنی سواری ٹھہرا کر مجھ سے مصافحہ کیا یا مجھے خواب میں آنحضورؐ نے فلاں حکم دیا۔ تو ایسے شخص کے بارے میں کیا وضاحت ہوگی؟ کیا ایسا شخص وہم الیقین کا شکار ہے یا صریحاً "کاذب"؟ کسی ایسے شخص کی باتوں پر یقین کرلینا اور اسے اپنا شیخ طریقت بنا لینا کسی اہلِ طلب کے لیے سودمند ہوسکتا ہے؟

اس سوال کے جواب میں اولاً یہ حقیقت واضح کر دینا ضروری ہے کہ اہل عرفان ایسی دعوے گیری سے گریز کرتے ہیں۔ ایسے کسی اعلان یا دعوے سے کسی شخص کا حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے باطنی تقرب کا تعد ہی نا ثابت رہتا اور اس طرح سے اپنی روحانی عظمت کی دلیل پیش کرنا اصول طریقت کے خلاف ہے۔ ایسا شخص وہم الیقین کا شکار بھی ہو سکتا ہے اور صریحاً کاذب بھی۔ ایسی دعویٰ گیری پہ تحقیق کا تعلق فی الحقیقت دعویٰ گیر شخص کے باطن سے وابستہ ہے جس میں مکر بھی داخل ہو سکتا ہے اور وارداتی معاملہ کی غلط فہمی بھی۔ اور یہ حتمی فیصلہ نہیں دیا جا سکتا کہ ایسا کوئی شخص محض وہم الیقین ہی کا شکار ہے یا کہ محض کاذب۔ ایسے شخص کی باتوں پر یقین کر لینا اور اسے شیخ طریقت کے طور پر اپنا لینا شدید غلط فہمی ہے جس کے نتیجہ میں عقائد میں بگاڑ پیدا ہو سکتا ہے۔ واضح رہے کہ اہل اللہ حضرات اپنے مکشوفات اور واردات قلبی کی ایسی قصہ گوئی سے گریز کرتے ہیں جو کہ محض اُن کی اپنی روحانی عظمت یا تقرب حضوریؐ پر دال ہو اور جس کا کسی مسئلہ طریقت سے تعلق نہ ہو۔ اہل عرفان اگر کسی ایسی وارداتِ باطنی سے دوچار ہوئے ہوں جو اُن کے نزدیک آنحضورؐ سے ان کے باطنی تقرب پر دلالت کرتی ہو تو یہ حضرات اس کے انکشاف سے گریز کرتے ہوئے خاموشی اختیار کرتے ہیں۔

بایں ہمہ اس کا یہ مطلب اخذ نہ کیا جائے کہ آنحضورؐ سے مشاہداتی تقرب کی غماز ہونے والی ہر باطنی واردات محض وہم الیقین ہی کی قیاس ہے۔ اور اس کے اظہار پر مہر سکوت لازم ہے۔ عارفین کا آنحضورؐ سے مشاہداتی رابطہ بھی ہوتا ہے، انہیں ہدایت یابی بھی ہو سکتی ہے اور بعض اوقات دیے

الفاظ میں ان حضرات سے اس امر کا انکشاف بھی ہو جاتا ہے۔ مگر یہ انکشاف تکرار پذیر نہیں ہوتا جو دعویٰ گیری سے تعبیر کیا جا سکے۔ نیز یہ عموماً ایسے حالات میں ہوتا ہے جبکہ دین حق میں رخنہ اندازی ہو رہی ہو، کوئی فتنہ ابھر رہا ہو یا ایسا الجھاؤ پیدا ہو رہا ہو کہ جس کی شرح میں قرآن و حدیث خاموش معلوم ہو رہے ہوں اور پیش آمدہ حالات میں اجتہادی فیصلہ کسی ظاہری یا باطنی سند کا منتظر ہو۔

⁂ ⁂ ⁂

فیوض کی اقسام

فقرأ اور صوفیا سے من جانب اللہ بوسیلہ مرشد پاک صلی اللہ علیہ وسلم ہر قسم کے فیوض کا نزول ہوتا ہے لیکن اکثر حضرات سے کسی خاص قسم کا فیض نسبتاً زیادہ جاری ہوتا ہے جبکہ کسی دیگر قسم کا کم۔ اقسام فیوض کی روانی میں یہ امتیاز اور مدوجزر قدرتی نظام کے تحت ہے اور اس کا تعلق صاحب دل حضرات کی انفرادی آن سے وابستہ ہوتا ہے۔ اہل اللہ سے جاری ہونے والے فیوض کی درج ذیل چار معروف اقسام پر اجمالاً تبصرہ کیا جاتا ہے۔

(۱) **باطنی فیض** یہ روحانی سلاسل کا فیض ہے جس کا تعلق تزکیہ نفس، تصفیہ قلب، حصول روحانیت، اصلاح باطن، عبور منازل اور اکتساب عرفان سے ہے۔ یہ فیض تحفہ مرشدیت ہے جو کسی سالک کو مرشد پاک کے وسیلہ سے عطا ہوتا ہے یا اسے اپنے مرشد کے طفیل کسی دیگر بزرگ کے پاس جانے یا اُس کے مزار پر حاضری دینے سے حاصل ہوتا ہے۔ اس روحانی فیض کے طالبین اپنے شیخ کے علاوہ کسی دیگر بزرگ کے پاس حاضر خدمت ہونے کی صورت میں اس بزرگ کو اپنے ہی شیخ کی شبیہ

میں دیکھتے ہیں اور مستفیض ہوتے ہیں نیز خود بھی تصورِ شیخ میں ہوتے ہیں۔ ایسا طرزِ عمل طریقت و معرفت کی رُو سے لازمی ہے۔ یہ فیض نعمتِ اولیٰ، فیضِ عظیم اور اُمّ الفیوض ہے لیکن طالبین کو اس کے حصول میں جملہ خواہشات سے بے نیاز رہنا پڑتا ہے۔ اس کی تقسیم پر روحانی طور وہ بزرگ مامور ہوتے ہیں جو اہلِ حال ہوں اور اُن کا فنائیت سے تعلق ہو۔

(۲) **دینی فیض** فیض کی اِس قسم کا تعلق اشاعتِ دین، فروغِ انسانیت، تطہیرِ اذہان، اصلاحِ نفسانی، تبلیغِ اسلام اور اسلامی نظامِ حیات کی تعلیم و تدریس سے وابستہ ہے۔ یہ فیض قریباً ہر اہلِ اللہ سے جاری ہے لیکن اکتسابی اور کتابی علومِ دینیہ پر دسترس رکھنے والے عارفینِ اسلام اور صوفیائے عظام اس فیض کی ترسیل میں زیادہ حصہ دار ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں علمائے ظواہر بھی اس فیض کی ترسیل میں شامل ہیں۔

(۳) **دنیوی فیض** فیض کی یہ قسم دنیوی مراد برآری اور خواہشات و حاجات کی تسکین سے متعلق ہے۔ فقرا حضرات کی محفلوں میں شمولیت دنیوی سطح پر بھی خیر و برکت اور ترقی و خوشحالی کا ذریعہ ثابت ہوتی ہے اور بعض اوقات طالبینِ دنیا کو کئی معاملات میں ایسی نوعیت کا فیض حاصل ہوتا ہے جس کا تعلق دنیاوی زندگی سے وابستہ ہوتا ہے۔ عارفین کی نگاہ میں فیضِ دنیاوی سب سے نچلے درجہ کا فیض ہے جس کے ثمرات دیرپا نہیں ہوتے کیونکہ دُنیا عارضی اور فانی ہے۔ لہٰذا اس کے فوائد برائے نام ہیں جبکہ بعض اوقات ردِ عمل کے طور پر انجام کار متوقع نقصانات کا احتمال کئی گنا زیادہ ہوتا ہے۔ ایک قدرتی نظام کے تحت یہ وقتی فیض اُن فقرا سے نسبتاً زیادہ جاری ہوتا ہے جو مست و بے خود اور سراپا مستغرق ہوں۔

اور حالتِ سکر میں رہنے کی وجہ سے باطنی اور دینی فیض کی ترسیل میں برائے نام حصہ دار ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حاجت روا، مشکل کشا اور کارساز ربِ عظیم کی ذات ہے جس کی مشیت کے بغیر کوئی فرد خشک گھاس کا ایک تنکا بھی نہیں توڑ سکتا۔ بارگاہِ ایزدی میں کسی دعا کی قبولیت نہ ہونے کی صورت میں کچھ بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا۔ (البقرہ۔ ۱۶۵) چنانچہ متذکرہ نوعیت کے فقراء حضرات سے جاری ہونے والا فیض بھی اُسی مالکِ حقیقی کی دین ہے۔

مشاہداتی معاملہ ہے کہ مجذوب حضرات کے پاس جانے والے کچھ حالمیں دنیا اور تشنگانِ خواہشات کی مرادیں پوری ہوئیں اور وہ اس وہم الیقین میں بحد شرک مبتلا ہو گئے کہ "فلاں باباجی نے ہمارا کام کر دیا"۔ مجذوب حضرات کے پاس جانے والے تشنگانِ خواہشات کی کثیر تعداد راہ سلوک سے مطلقاً کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ فقراء سے ان کی عقیدتمندی کے پس پردہ ان کی نفسانی خواہشات کی تڑپ کارفرما ہوتی ہے۔ نفسانی تشنگی جاہلانہ عقیدت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ خواہش پوری ہونے پر ان کے نفس کو سرور ملتا ہے اور نفسانی سرور و خمار سے نئی خواہشات جنم پذیر ہوتی جاتی ہیں۔ یہ وہ وقتی نفع ہے جو اُن کے نفسِ امارہ کو حاصل ہوتا ہے نہ کہ روح کو۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔ "وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ (البقرہ۔ ۲۱۶) یعنی یہ ممکن ہے کہ تم کسی چیز سے نفرت کرو اور تمہارے لئے بہتر ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرو اور وہ تمہارے لئے نقصان دہ ہو"۔ ابن آدم جن چیزوں کی خواہش کرتا ہے وہ اس کے لئے نقصان دہ بھی ثابت ہو سکتی ہیں۔

ہر چمکدار چیز سونا نہیں ہوتی، آتش بھی ہو سکتی ہے بلکہ آتش میں سونے سے کہیں زیادہ چمک ہے۔ لیکن یہ عارضی ہے اور اس کا انجام راکھ ہے حدیث پاک سے ثابت ہے کہ مصائب و تکالیف اکثر خطاؤں کا کفارہ بن جاتی ہیں۔ ان سے خروج و نجات کے لئے دعا کے ساتھ ہی ساتھ بالمعروف اور عملی جدو جہد بہترین طریق کار اور اچھی روش ہے۔ اگر بالفرض کسی تشنۂ ہوس کی کچھ خواہشات اور امیدیں اتفاقاً کسی بزرگ کی دعاؤں سے پوری ہو جائیں اور وہ جہد و زاہد میں بدستور ناقص العمل رہے یا بعد ازاں مزید کبائر کا مرتکب ہو جائے تو اس عالم ناسوت میں اس سے سرزد ہونے والی لغزشوں اور خطا کاریوں کے کفارہ کے لئے قدرتی اور فطری ذرائع محدود ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس ایک طالب حق سالک کو حیات عنصری میں ہی اپنے اعمال و افکار کا محاسبہ کرنا پڑتا ہے۔ اس کے جملہ مذموم اعمال یا افکار اور وسواس و جذبات اس کے نفس کے لئے موجب تعزیرات بنتے ہیں۔ بلکہ طرہ اس پر یہ کہ بعض اوقات ان گنت آزمائشوں کا بھی نزول ہو جاتا ہے فرمان نبوی ہے "اِنَّ اللّٰہَ یُجَرِّبُ الْمُؤْمِنِیْنَ کَمَا یُجَرِّبُ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ بِالنَّارِ" یعنی بے شک اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو مصیبت اور بلاؤں سے آزماتا ہے جس طرح سونا چاندی آگ پر رکھ کر پرکھا جاتا ہے۔

مجذوب فقرا کی صحبت نشینی کرنے والے اور ان سے قربت و رابطہ رکھنے والے بعض دنیا پرست افراد کئی دفعہ ایسے قانونی یا اخلاقی جرائم کا بھی ارتکاب کر بیٹھتے ہیں جن کے ردِ عمل کے طور پر معاشرہ میں فتنہ و فساد برپا ہو جاتا ہے یا ان کے کسی اقدام سے کوئی فرد یا گروہ مظلوم و محروم ہو جاتا ہے۔ ان کا یہ اقدام اس خوش فہمی کا سبب ہوتا ہے کہ "باباجی سے دعا

کرا لیں گے اور معافی ہو جائے گی"، کسی بھی بزرگ سے عقیدت و ارادت کے سبب نفس کو اس طرح کی شہ سراسر احمقانہ تصور ہے۔ تلافی کے بغیر معافی کا کوئی جواز نہیں۔ میزانِ عدل ضرور قائم ہو گا اور ایک ایک مثقال کا حساب ہو گا۔ البتہ ایسے اتفاقات کئی حضرات کے مشاہدہ میں آئے ہوں گے کہ بعض دنیا پرست افراد سنگین جرائم کے ارتکاب کے بعد کسی مجذوب کے پاس گئے اور وہ اتفاقاً یا مجذوب کی دعا کے نتیجہ میں قانونی یا اخلاقی گرفت سے بچ نکلے۔ ایسا اتفاق گاہے گاہے ہی ہوتا ہے۔ لیکن اگر یہ کسی مجذوب کی دعا کا ہی نتیجہ تصور کر لیا جائے تو یہ اُس مجذوب کی طرف سے اُن دنیا پرست افراد کے نفس کو فیض ہے نہ کہ روح کو۔ یہ نادی فیض محض وقتی نجات کا سامان بننے کے بعد ختم ہو جاتا ہے اور اپنی صفت کے اعتبار سے اپنے ردِّ عمل میں وبالِ جان ثابت ہوتا ہے۔ دنیاوی سطح پر کسی جرم یا گناہ کی فوری سزا سے بچ نکلنا معافی کی دلیل نہیں بلکہ سزا آئندہ یا اخروی زندگی میں منتقل ہو جاتی ہے۔ کسی مجذوب سے دنیاوی طور پر فیضیاب ہونے والے تشنگانِ ہوس اکثر اوقات اس وہم الیقین کا بھی شکار ہو جاتے ہیں کہ باباجی نے اس دُنیا میں بھی اُن کی داد رسی کی ہے اور اُخروی زندگی میں بھی اُن کی نجات کا سامان بنیں گے اور گناہوں کی بخشش کا وسیلہ ثابت ہوں گے۔ ایسا گمان ان کے نفس کا فریب اور شدید غلط فہمی ہے۔ میزانِ عدل برحق ہے نیز یہ کہ بندگانِ خدا کی حق تلفی دل آزاری اور ان پر ہونے والے ظلم کے نتیجہ میں اُخروی زندگی میں سزا کی وعید قرآن و حدیث کی رُو سے ثابت اور واضح ہے جس میں کسی لچک یا رعایت کی کوئی گنجائش نہیں۔

فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۝ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ۝ (الزلزال ۔ ۷، ۸)

(۴) **برزخی فیض** | فیض کی یہ قسم بالکل پوشیدہ ہے۔ اکثر اولیائے کرام کی روح اقدس کی طرف سے بوسیلہ مرشد پاک صلی اللہ علیہ وسلم من جانب اللہ ان افراد کی روح کو فیض جاری ہے جو کہ اس دار فانی سے کوچ کر چکے ہیں۔ اس فیض کی ترسیل و تنقیل میں زیادہ تر وہ اہلِ حال اور صاحب کمال پوشیدہ قلندر حضرات حصہ دار ہیں جن کی روح انوار و تجلیات سے معمور ہے اور وہ اس عالم شہادت میں نامساعد حالات اور حکمتِ خداوندی کے تحت فیوض کی مذکورہ بالا تینوں اقسام کی تقسیم و ترسیل میں برائے نام حصہ پاتے ہیں۔ اکثر کی شہرت برائے نام اور زندگی نہایت سادہ ہوتی ہے۔ بعض علوم افلاک کے رازآشنا ہونے کے باوجود کتابی اور اکتسابی علوم سے زیادہ بہرہ ور نہ ہونے کی وجہ سے تبلیغات میں بڑھ چڑھ کر حصہ نہیں لے سکتے۔ بعض کو اجازت و خلافت ہی نہیں ملی ہوتی کہ روحانی سلسلہ چلا سکیں یا اگر مل بھی چکی ہو تو معاشی پریشانیوں میں دبے پسے رہنے کی وجہ سے اُن میں سلسلہ چلانے کا رجحان ہی نہیں اُبھرتا۔ بعض دنیاوی لحاظ سے خاندانی سطح پر زیادہ کمزور ہونے کی وجہ سے وراثتاً یا اکتساباً ایسے اثر و رسوخ کے حامل نہیں ہوتے کہ وہ اپنے کلام سے دنیادار افراد کی توجہ کا مرکز بن سکیں۔ علاوہ ازیں یہ حضرات تارک الدنیا اور مجذوبی حالت میں بھی نہیں ہوتے کہ تشنگانِ خواہشات کی توجہ کا مرکز بنیں رہیں ایسے حالات میں ان بزرگوں کے ظاہری اور محسوساتی فیوض کی قدرتی طور پر ناکہ بندی ہو جانے کی صورت میں ان کا فیض متوفین کی طرف عالم برزخ میں منتقل ہوتا رہتا ہے اور صرف اہل سلاسل تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ روحانی سلاسل سے غیر منسلک ارواح کو بھی بلا تخصیص پہنچتا ہے۔ یہ ان

سکے اپنے بس اور دخل کی بات نہیں بلکہ حکمت و دانائی کی کرشمہ سازی اور کرم نوازی کا نتیجہ ہے۔ انتقال فیوض کی اس قدرتی نوعیت سے انکار کا کوئی جواز نہیں۔ ہم روزمرہ زندگی میں بھی وقتاً فوقتاً اپنے متوفی اقربا اور اسلاف کے ایصالِ ثواب کے لئے ختم شریف اور تقسیم خیرات وغیرہ کا اہتمام کرتے ہیں اور اس کا معنوی اعتراف کرتے ہیں۔ نیز قبروں پر فاتحہ خوانی کر کے متوفین کی ارواح کو ثواب رسانی کی سنت ادا کرتے ہیں۔ ایصالِ ثواب کے یہ طریقے صحیح الاسناد احادیث سے ثابت ہیں۔

اس حقیقت سے کسی صاحب حال کو انکار نہ ہوگا کہ بعض سالک حضرات کو حیات عنصری میں لامتناہی مصائب و تکالیف اور آزمائشوں سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ دنیاوی سیہ بختیوں، محرومیوں اور ناکامیوں کی کوئی ایسی قسم باقی نہیں رہتی جس کے زہریلے نشتر سے انہیں ناقابلِ برداشت تکلیف کا عملاً تلخ تجربہ حاصل نہ ہوا ہو۔ انہیں ایسا محسوس ہوتا ہے گویا دنیا میں قہر و جبر کے جملہ خزانوں کا نزول ان کے نفس پر ہو چکا ہے۔ دُنیا و مافیہا سے لاتعلقی اختیار کر کے خلوت نشینی میں چلہ کشی یا مراقبہ جات کی دیرپا مشقیں تو نفسانیت کو بے ہوش کر کے اس پر چھری چلانے کے مترادف ہیں کیونکہ اس طریق کار سے طاری ہونے والی مستی اور لذت ذکر میں بدنی اور ذہنی تکلیف کی تحلیل ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کے برعکس ان حضرات کو پریشان کن تصادم اور پیچیدہ مصروفیات میں مبتلا رہنے اور عبادانی امور میں محو رہنے کی وجہ سے "مراقبہ جلوت" قائم رکھنا پڑتا ہے۔ نیز ہوش میں بے ہوشی اور بے ہوشی میں ہوش قائم رکھنے کی نیدھن کے سبب یہ حضرات تڑپ تڑپ

کر جان دیتے اور مر مر کے جیتے ہیں۔

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را
ہر زماں از غیب جانے دیگر است

ایسی صورتِ حال میں جبکہ اُن کی حرکت و عمل سے پیوستہ تسلیم کی آزمائش میں قربانی کے لئے انہیں غیب سے ہر لمحہ نیا جذبۂ جاں میسّر ہو انہیں قدرتی طور پر یہی خیال آتا ہے کہ وہ ابھی منزل سے بہت دور ہیں۔ ممکن ہے باطنی وارداتِ سیاحت و کشف و کرامات بھی ان میں سے بعض یا اکثر حضرات سے دور بھاگتی ہوں لیکن حالات کے غیر محسوساتی مجاہدہ میں ذکر و فکر اُن کی نفسانی انانیت کو اندر ہی اندر چھلنی اور گھائل کر چکا ہوتا ہے اور آنِ حق نما پیشِ نظر رہتی ہے۔ حقیقت شناس ہونے کے باوجود اُنہیں کسی مقام پر قدرتی طور پر یہ خیال آنا بھی امکانی امر ہے کہ وہ کتابی اور اکتسابی علوم سے زیادہ بہرہ ور نہ ہونے کی وجہ سے مخلوقِ خدا کی کوئی محسوساتی خدمت سرانجام نہیں دے سکے اور شاید تا دمِ آخر مصائب و امتحانات میں ہی مبتلا رہیں گے۔ ان حضرات کے ذہن میں اِس قسم کا خیال اچانک اور بلا شکوہ پیدا ہونا اِن کے حالات کے پیشِ نظر راہِ سلوک میں بڑی اچھی بدعت ہے کیونکہ ایسے حالات میں جبکہ اُن کی حیاتِ عنصری سراپا امتحان اور مجاہدہ ہو وہ یہ تصور نہیں کر سکتے کہ وہ عارضی اور فانی زندگی کے کسی حصہ کو آرام اور مزے سے گذاریں گے۔ صوفیانہ جُبّہ و قبہ، تسبیح و سجادہ، دلق اور خطاباتِ قطبیت و غوثیت سے بے نیاز یہ پوشیدہ قلندر حضرات افلاکِ معرفت کے وہ غیر مرئی درخشاں ستارے ہیں جن کو اہلِ نظر ہی دیکھ سکتے ہیں۔ مرشدِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل ان کا سرچشمۂ فیض عالمِ برزخ میں جاری و ساری

ہے ۔ حضرت خواجہ اویس قرنیؒ بھی اسی نوع کے روحانی جوہر تاباں کے پیش نظر حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو اپنا جبّۂ مبارک ارسال فرمایا اور ساتھ ہی بذریعہ پیغام ہدایت فرمائی کہ "آپ ہماری امت کی بخشش کے لئے دعا کریں"۔

یہاں اس امر کی وضاحت کر دینا بھی ضروری ہے کہ حال میں داخل ہونے کے بعد سالک کا تعلق عالمِ برزخ سے وابستہ ہو جاتا ہے۔ عارفینِ باکمال کے لئے عالمِ شہادت اور عالمِ برزخ کا درمیانی فاصلہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ اہلِ حال حضرات کی ظاہری آنکھ عالمِ شہادت اور چشمِ باطن عالمِ برزخ میں ہوتی ہے۔ نتیجتاً ظاہر اور باطن ایک ہو جاتا ہے یہاں تک کہ ان کی پُرفیوض نگاہ فوری طور پر عالمِ شہادت سے برزخ اور برزخ سے عالمِ شہادت میں منتقل ہو سکتی ہے۔

؎ جہاں میں اہلِ ایمان صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے۔ اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

برزخی فیض کی بات بیان کردہ حقائق سے اس امر کی از خود وضاحت ہو جاتی ہے کہ انسانی خدمات اور خلافتی فرائض محسوساتی اور ظاہری ہونے کے علاوہ غیر محسوساتی اور باطنی بھی ہیں نیز یہ کہ کسی صحیح الفکر طالبِ حق اور اہلِ حال سالک کا وجود بے خدمت نہیں خواہ وہ دنیاوی لحاظ سے کتنا ہی محرومِ وسائل ہو اور معاشرہ میں اس کا ظاہری مقام کچھ بھی ہو۔

⁂ ⁂ ⁂

رُوحانیت کا انقباض

جس طرح ابنِ آدم اپنی مادی زندگی میں بسا اوقات نزلہ زکام کھانسی بخار یا کسی دیگر مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے اسی طرح اہلِ سلوک حضرات میں بھی کئی افراد بعض اوقات اپنی روحانی زندگی میں ایک باطنی مرض سے متاثر ہوتے ہیں جسے روحانی انقباض کہا جاتا ہے۔ اہلِ سلوک کی پرائیویٹ اور انفرادی زندگی کی روشنی میں اس انقباض کے کئی محرکات اور اقسام ہو سکتی ہیں۔ لیکن ذیل میں اس کی پانچ اقسام پر تبصرہ کیا جاتا ہے۔

(۱) اعتقادی لغزش سے انقباض

اہلِ اللہ کے پاس جانے والے اکثر و بیشتر عقیدت مند اپنے ساتھ کوئی دنیاوی خواہش لے کر جاتے ہیں اور اسی امید و خیال سے بیعت کرتے ہیں کہ ان کی خواہش پوری اور پریشانی دُور ہو جائے گی۔ بعض اوقات ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ بزرگ کی طرف سے کی جانے والی دُعا قبول ہو جاتی ہے اور ان افراد کی مطلوبہ خواہش پوری ہو جاتی ہے۔ اس کے نتیجہ میں ایسے مریدوں کی اپنے روحانی پیشوا سے جذباتی عقیدت وابستہ ہو جاتی ہے اور وہ مسئلہ حال کو گہرائی تک سمجھے بغیر اپنے پیر کو حاجت روا مشکل کشا اور کارساز تصور کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

حاصل ہونے والی ہر خوش بختی کو پیر کی نگاہ لطف و کرم کی مرہونِ منت
خیال کرتے ہیں۔ قدرتی طور پر خواہش کی تسکین ہو جانے کی وجہ سے اُن
کی حوصلہ افزائی ہو جاتی ہے اور ذکر و فکر میں اُن کی دلچسپی زیادہ ہو جاتی
ہے۔ طریقت کا مسلمہ اصول ہے کہ راہِ سلوک میں اطاعتِ شیخ اور پیر و
پیشوا سے قلبی عقیدت وابستہ ہونے کی صورت میں مرید پر نزولِ فیوض
ہوتا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ عقیدت جاہلانہ ہو یا عارفانہ۔ بیعت
کے بعد ایسے افراد پر روحانی فیوض کے نزول میں یہی اصول کارفرما ہوتا ہے ایک
طرف یہ افراد کسی حد تک روحانی طور پر مستفیض ہوتے ہیں لیکن
دوسری جانب ان کے قلب و ذہن میں یہ خیال پیوست ہو جاتا ہے کہ ان
کی ہر نوع کی دنیاوی پریشانی ان کے پیشوا کی دعا و نگاہ سے آئندہ بھی
دور ہو گی۔ بعد ازاں ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ یہ لوگ کچھ دنیاوی پریشانیوں
میں مبتلا ہو جاتے ہیں یا دنیاوی جاہ طلبی کی کوئی خواہش انہیں اپنی لپیٹ
میں لے لیتی ہے جس کی تکمیل کا انہیں کوئی حل دکھائی نہیں دیتا۔ اس
دارالامتحان میں ردِ مصائب اور تکمیل خواہش میں ان کی بے بسی انہیں عجیب
الجھن کا شکار بنا دیتی ہے۔ دنیاوی لحاظ سے ان پر خوش بختی کے دروازے
وقتی طور پر یا غیر معینہ عرصہ کے لئے بند ہو جاتے ہیں۔ عجز و انکساری کا کوئی
ذریعہ دعا کی قبولیت میں کارگر ثابت نہیں ہوتا۔ شیخ سے دعائیں کراتے
کا کوئی بار آور نتیجہ برآمد نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات لینے کے دینے
پڑ جاتے ہیں اور صورتِ حال پہلے سے بھی زیادہ خراب ہو جاتی ہے۔
ایسے موقع پر ان کی شیخ سے وابستہ بے بصیرت جذباتی عقیدت پاش
پاش ہو جاتی ہے۔ وہ پیشوا جسے یہ حاجت روا مشکل کشا، کارساز،
سمیع، بصیر، علیم، خبیر اور مزید بہت کچھ سمجھتے تھے اس کے متعلق ان

افراد کا عقیدہ یکسر بدل جاتا ہے اور وہ اپنے فہم و ادراک کے مطابق اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ

ع جنہیں سجدے کئے ہم نے وہ پتھر کے صنم نکلے

اس خیال و احساس سے یہ لوگ شیخ سے مکمل گریز کر جاتے ہیں۔ ان کی نظر میں راہِ سلوک کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی اور یہ یہی سمجھ بیٹھتے ہیں کہ یہ راستہ سرے سے ہی شرک پر مبنی ہے۔ ایسی صورت حال میں "تصور" کا معاملہ بگڑ جاتا ہے اور یہ افراد روحانی انقباض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ نیز عقیدہ درست نہ ہونے کی صورت میں یہ انقباض تھوڑی ہی مدت میں انضباط کی شکل اختیار کر جاتا ہے۔

اپنے قلب کے آئینہ میں جھانکنے سے متذکرہ افراد پر اس امر کا واضح انکشاف ہو سکتا ہے کہ راہِ سلوک میں ان کا داخلہ کسی دنیاوی خواہش کی تسکین و تکمیل کا موجب یا متقاضی تھا۔ انہیں بزرگ سے کئی امیدیں وابستہ تھیں۔ انہوں نے خوش فہمیوں اور امیدوں میں بیعت کی جبکہ راہِ سلوک میں داخلہ خالصتاً طلب حق کے لئے ہونا لازمی ہے۔ تصوف خواہشات کی نفی کرتا ہے اور یہ خواہشات کی اثبات چاہتے تھے۔ نیز تصوف اس بات کا بھی تقاضا نہیں کرتا کہ راہِ سلوک کا کوئی طالب دنیاوی خواہشات یا کسی نفسانی مفاد کے تحت بیعت کرے۔ عشقِ حقیقی میں خواہشات کا مقام صفر ہے۔ یہاں بظاہر جائز خواہشات تو درکنار بلکہ بعض اوقات بنیادی حاجات کی بھی قربانی دینا پڑتی ہے۔ حرکت و عمل سے وابستہ تسلیم و رضا اور جہد و زہد سے پیوستہ صبر و قناعت اس کے بنیادی اصول ہیں۔ متذکرہ افراد کے روحانی انقباض کا دوسرا محرک ان کا جہل تھا۔ بوقتِ بیعت ان

کی کوئی خواہش پوری ہونے پر ان کا اتفاقاً ایسا عقیدہ بن گیا کہ شیخ کے پاس ہر دنیاوی الجھن اور تمام مشکلات کا حل موجود ہے حالانکہ ان کی باطنی بصیرت اس ضمن میں بے ادراک تھی کہ آئینہ حال میں شیخ کی حقیقت اور اس کا جوہر کیا ہے۔ وہ اس امر سے بھی آگاہ نہ تھے کہ شیخ کی آن انسانی ایسی حیثیت میں ہوتی ہے جس کا مشن محض مقاصد اولیٰ کی تکمیل ہے۔ اگر شیخ طریقت کسی مصیبت زدہ کی التجا پر دعا بھی کرے گا تو مصلحت و رائی کے سبب قبولیت نہ ہونے کی صورت میں شیوۂ تسلیم و رضا اس کا دامن گیر ہوگا۔ دعا کرنا یا کرانا سنت و مستحب ہے لیکن دعا میں تکرار کی انسانی خواہش اکثر اوقات مقاصد اولیٰ کی تکمیل میں ضم ہو جانے کا تقاضا کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ بزرگ عقیدت مندوں اور مریدین کو دعا کے ساتھ ہی ساتھ کوئی عملی مشورہ بھی دیتے ہیں۔ ان افراد کے روحانی انقباض کا باعث بننے والا تیسرا محرک تصوف میں مروجہ بعض غیر واضح تعلیمات ہیں۔ یہ درست ہے کہ ابتدا میں ان کی کچھ پریشانیاں دور ہوئیں اور وہ مسئلہ تصور کو گہرائی سے سمجھے بغیر اپنے پیر کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھنے لگے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ بعض صوفیا حضرات کی محفلوں سے ملنے والی غیر واضح تعلیمات اور محفل سماع میں سنے جانے والے کلام نے جس کا ظاہر کے طفیل اصل تعلق باطن سے ہوتا ہے ان کے عقائد میں جلتی پر تیل کا کام دیا اور ان کا یہ یقین ایمان میں تبدیل ہو گیا کہ ان کے جملہ دنیاوی اور اخروی امور کی تقدیر سازی کا قلمدان ان کے پیر کے دست تصرف میں ہے۔ بعد ازاں ان پر جب کلام ربانی " وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ " کے موجب آزمائشوں کا بوجھ پڑا تو شاخ نازک پر

کا آشیانہ پائدار ثابت نہ ہوا اور "نیم سالک خطرہ وجدان" کے مصداق ان کا ذہن ہی تصوف سے منحرف ہو گیا۔

متذکرہ واردات سے دل برداشتہ اور متاثر ہونے والے حضرات کے لئے اس امر سے آگاہ ہونا لازمی ہے کہ راہ سلوک حیاتِ عنصری کا پلصراط ہے۔ نفسانی انانیت کو ختم کرنا پتھر کو نچوڑ کر آبِ حیات برآمد کرنے کے مترادف ہے۔ یہاں جملہ خواہشات کی نفی درکار ہے۔ نیز یہ کہ حیاتِ عنصری میں دنیاوی سطح پر ہر شخص عاجز و نیازمند اور محتاج ہے قادرِ مطلق صرف اور صرف ربِ عظیم کی ذات ہے۔ حقیقتِ حال یہ ہے کہ شیخ کی حیثیت شخصی سے قضا و قدر سے متعلق بے جا توقعات وابستہ کرنا جاہلانہ روش، قطعی خام خیالی اور صریحاً کج فکری ہے۔ اگر ایسے افراد شروع ہی سے شیخِ طریقت سے بے جا امیدیں قائم نہ کرتے تو یقیناً اس نوع کے انقباض کا شکار نہ ہوتے۔ اعتقادی لغزش میں مبتلا افراد اگر خواہشات کو وبالِ نفسانی تصور کرتے ہوئے ان کی نفی کر کے شیخ سے رابطہ استوار کر لیں تو یہ ایک احسن اقدام ہوگا۔ ان کے لئے سنجیدہ صوفیا حضرات کی محفلوں میں حاضری دینا اور کثرت سے درود پاک کا ورد کرنا نہایت مفید ہے کیونکہ یہ دونوں ذرائع عقائد کی صفائی اور مرشد کی جانب رغبت کا باعث بنتے ہیں۔ مشاہداتی معاملہ ہے کہ سنجیدہ صوفیاء کی محفلوں میں شمولیت اختیار کرنے سے ایسے کئی سالکین کا رجحان دوبارہ سلوک و تصوف کی طرف تو مائل ہو جاتا ہے مگر بعض اوقات اپنے شیخ کی طرف رجعت میں دوبارہ مائل نہیں ہوتا اور یہ کسی اور بزرگ سے بیعت کے متمنی ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے کہ وہاں سے دنیاوی خواہشات بموجب منشا پوری نہ ہو سکیں۔ اپنی کج فکری

کی وجہ سے شیخِ طریقت سے لاتعلقی اختیار کرنا جاہلانہ اقدام ہے۔ کئی طالبینِ حق نے بھی کسی بزرگ سے بیعت کرنے کے بعد مناسب عرصہ گزرنے پر کسی دیگر بزرگ سے بیعت کی اور کرتے ہیں۔ لیکن اِن کا نکتۂ نظر کچھ اور ہوتا ہے۔ طالبِ حق کی طلب کا تقاضا ہوتا ہے کہ وہ "صاحبِ پیر" ہونے کے بعد "صاحبِ مُرشد" بھی ہو۔ پیر کا تعلق قال سے ہے جبکہ مُرشد کا حال سے اور حال کا تعلق حال وارد ہونے سے ہے۔ جب تک سالک کی باطنی نسبت استوار نہیں ہو پاتی "وہ" صاحبِ پیر" ہوتا ہے۔ شیخِ طریقت کے وسیلہ خصوصاً سے روحانی بیعت میں داخل ہونے سے کم و بیش عرصہ کے بعد طالبینِ حق پر معرفت کی بیعت کی علامتی کیفیات گزرتی ہیں۔ ان کی باطنی نسبت قائم ہوتی ہے اور ان پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ یہ معاملہ خالصتاً اپنے آپ کا ہے جو کہ شیخ کی نسبتِ بیعت کے وسیلہ سے نمودار ہو کر پروان چڑھتا ہے۔ مرشد کا بموجبِ حال پتہ چلتا ہے اور اس امر کا انکشاف ہوتا ہے کہ مرشد فی الحقیقت اہلِ طلب کے لئے طلبِ حق میں دستگیر ہے، جملہ فانی مرغوبات اور نفسانی خواہشات کی نفی کا تقاضا بیدار کرتا ہے اور صرف طلبِ حق میں رواں دواں رہنے کا ذوق تازہ کرتا ہے۔

(۲) خضوع و خشوع میں کمی سے انقباض

ارشاد ربانی ہے۔ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا (المزمل) یعنی اپنے رب کو یاد کرو اور ہر طرف سے ٹوٹ کر اسی کے ہو جاؤ۔ مذکورہ فرمان کی روشنی میں سلوک سالک کی طرف سے ہمہ وقتی خضوع و خشوع کا متقاضی ہے۔ لیکن سالک کے لئے حیاتِ عنصری میں ناسا عد حالات کے ایسے دور سے گزرنا بھی امکانی امر ہے جس کے سبب دِل

سکے طور پر اس کے خضوع و خشوع میں خاصی کمی واقع ہو جاتی ہے اور وہ نتیجتاً روحانی انقباض میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس کیفیت میں سالک کو باطنی طور پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کی پرواز رک گئی ہے یا یہ کہ وہ روحانی طور پر تنزل پذیر ہو چکا ہے۔ وہ پہلے جیسے ذوق و شوق اور سوز و گداز سے محروم ہو جاتا ہے۔ اگرچہ اس انقباض میں سالک کو پیش آمدہ دنیاوی مصائب و تکالیف اور انواع و اقسام کی پریشانیوں کا منطقی طور پر خاصا دخل معلوم ہوتا ہے لیکن فی الحقیقت یہ آزمائشیں اس کے انقباض کا باعث نہیں بلکہ اس کی روحانی کسمپرسی کا اصل محرک اس کے نفسانی شکوات ہیں جو وسواس کی حیثیت سے نفس کے تہہ خانوں سے یکے بعد دیگرے ابھرتے رہتے ہیں اور اس کے وجدان پر غالب آ جاتے ہیں۔ ناسازگار حالات، دلخراش حادثات، تلخ تجربات اور مصائب و تکالیف سے پیدا شدہ شکوات کے یہ وسواس نفس انسانی میں اکثر اوقات "جرثومہ اضطرار" سے ارتقا پذیر ہوتے ہیں۔ اگر مرشد پاک کے تصور میں "لا" کی تلوار سے نفسانی گھبراہٹ کی نفی کا عمل جاری رہے تو اس کے ردِ عمل میں یہی جرثومہ تغیر پذیر ہو کر گھٹن اور تڑپ کا سبب بنتا ہے۔ یہی گھٹن اور تڑپ نشتر سوز و گداز کا کام دیتی ہے اور تندی بادِ مخالف سے گھبراہٹ نہ ہونے کی صورت میں رفعت پرواز ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں بعض اوقات ذمہ داریوں سے معمور، پریشان کن، متصادم اور پیچیدہ مصروفیات بھی خضوع و خشوع میں کمی کا باعث بنتی ہیں۔ اہلِ سلوک کو مراقبۂ خلوت کے لئے کوئی خاص وقت نہیں ملتا۔ ان کا ذکرِ پاس انفاس تقسیم توجہ کی وجہ سے ضعیف ہو

جاتا ہے جس کے نتیجہ میں وہ عارضہ انقباض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

عارفین کا متفقہ نظریہ ہے کہ متذکرہ حالات میں اگر ہر حرکت و عمل ذکر و فکر میں ہو اور مصروفیات کی انجام دہی خالصتاً عبادت کے طور پر ہوتی رہے تو اس انقباض تک نوبت نہیں پہنچتی۔ اگر حالتِ انقباض طاری ہو چکی ہو تو پیچیدہ اور متصادم مصروفیات کو چلہ کشی تصور کرتے ہوئے راہِ سلوک کا مشن جاری رکھنے سے اس نوع کا انقباض عموماً دور ہو جاتا ہے۔ در ایں حالات اگر شیخِ طریقت سے ظاہری ملاقات کی سعادت بھی نصیب ہو جائے تو معاملہ اور بھی زیادہ بہتر ہو گا کیونکہ ہر قسم کے انقباض کے تدارک کے لئے نسبتِ ظاہری کی جانب فوری رجوع نہایت ضروری اور مفید ہے۔

(۳) دنیاوی جاہ و حشمت سے انقباض

بعض اوقات کسی اہلِ سلوک کے لئے قدرتاً ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ اس پر دنیاوی خوش بختیوں کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ عرصہ دراز سے بگڑے ہوئے امور سدھر جاتے ہیں۔ معاشی معاشرتی اور خانگی سطح پر ہر معاملہ میں کامیابی اس کے قدم چومتی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے گویا جملہ دنیاوی خوش بختیاں قطار در قطار اس کا تعاقب و استقبال کر رہی ہیں۔ خوش بختیوں اور کامرانیوں کے دور میں یادِ الٰہی سے غفلت یا دنیاوی حرص و ہوس میں اضافہ کی صورت میں طاری ہونے والا انقباض تو یقینی امر ہے۔ یہ ایک واضح اور تسلیم شدہ حقیقت ہے جس پر تبصرہ مقصود نہیں، بلکہ یہاں اس نوع کے وجود و انقباض پر روشنی ڈالنا مقصود ہے جس میں سالک ایسے حالات میں کردار صحیحہ کے باوجود

مبتلا ہو جاتا ہے۔ اُس کے اعمالِ ظاہری میں بھی کوئی واضح فرق نہیں ہوتا اور اُس میں ذاتِ باری تعالیٰ کے تشکر اور احسان مندی کا جذبہ بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔ ذوق و شوق بھی بڑھ جاتا ہے، اور ذکر و فکر میں بھی دلچسپی زیادہ ہو جاتی ہے لیکن اُس کے "مقام" پر جمود طاری ہو جاتا ہے۔ اُسے نعمتِ سوز میسر نہیں ہوتی یا قبل ازاں اگر کسی وقت میسر ہوئی بھی ہو تو چھن جاتی ہے اور جہد و زہد کے باوجود اس نعمت کی بازیابی نہیں ہوتی۔

معمولی خطاؤں کا سرزد ہونا امکانی امر ہے اور عبادات میں عجز و انکساری اور دعا سے معافی تلافی بھی بعید از قیاس نہیں۔ سطور بالا میں متذکرہ حالات کے دوران طاری ہونے والا انقباض یا روحانی جمود اہلِ سلوک کی جانب سے قابلِ گرفت لغزشوں کا نتیجہ متصور نہیں ہوتا۔ عام سالکین و خلفا تو درکنار بڑے بڑے تاجدار اور خرقہ پوش خلفا پر متذکرہ حالات میں ان کے مثبت طرزِ عمل کے باوجود اسی نوع کا روحانی جمود طاری رہا جس سے نجات حاصل کرنے کے لئے وہ دنیاوی دولت اور جاہ و حشمت کو خیرباد کہہ کر تن تنہا صحرانوردی پر گامزن ہو گئے اور انجام کار ہر شے سے لاتعلقی اختیار کرنے کے بعد نعمتِ سوزِ حقیقی سے بہرہ ور ہوئے۔ اس سلسلہ میں امام غزالی رح اور شاہ ابراہیم ادھم کی تاریخی مثالیں موجود ہیں۔ امام صاحب مذکور دینی بصیرت اجتہاد اور فقہی مسائل میں یکتائے روزگار تھے۔ عظیم ترجمانِ اسلام، مفکر، فلاسفر، مناظر، فقیہہ اور مایہ ناز عالمِ دین ہونے کے باعث دنیا انہیں جھک کر سلام کرتی تھی۔ وہ ترکِ دنیا اختیار کرنے سے قبل مکمل تفکر و تحقیق کے بعد صوفیانہ مسلک اپنا چکے تھے، لیکن انہیں اس امر کا احساس ہوا کہ ان کی دنیاوی عزت، شہرت، شخصیت کا وقار اور

علمی گورکھ دھندے سوزِ حقیقت کی راہ میں بظاہر حائل ہو رہے ہیں۔ اسی طرح شاہ ابراہیم ادھم کو بھی اپنی بادشاہت میں مطلق العنان اور مکمل شاہی جاہ و جلال کا حامل ہونے کی حیثیت میں وہ گوہرِ مقصود نہ مل سکا جس کے وہ اپنی حکمرانی کے دور میں ہی متلاشی ہو چکے تھے۔ نتیجتاً اِن بزرگوں نے ایک عظیم نعمت کے حصول کے لئے دنیاوی شوکت و حشمت اور جاہ و جلال کو خیرباد کہا اور ترکِ دنیا کی راہ اپنائی۔

یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ کر دینا اشد ضروری ہے کہ شہرت، عزت اثر و رسوخ، اعلیٰ عہدہ داری، امارت، شہنشاہت اور دیگر وہ مراعات جن کا تعلق دنیاوی خوش بختی سے ہے فی الحقیقت راہِ سلوک میں حائل نہیں ہوتیں اور نہ ہی یہ براہِ راست روحانی انقباض کا باعث بنتی ہیں، بلکہ اِن جملہ دنیاوی خوش بختیوں کے نزول سے طاری ہونے والے روحانی جمود کی اصل الاصول نفسِ انسانی میں "وقار" اور "خمار" کے دو جرثومے ہیں جن کی مذکورہ حالات میں لاشعوری طور پر نشو و ارتقا ہوتی رہتی ہے۔ باغاتِ نفس کے شجر کاری نظام میں متذکرہ حالات کے تحت اِن دونوں بیجوں کی وہ آبیاری ہوتی ہے کہ بڑے بڑے اشجارِ ممنوعہ نشو و نما پاتے ہیں — یہ دونوں جرثومے نفسِ انسانی کی سرشت میں پیوست ہیں۔ جرثومۂ وقار سے نفسانی تکبر، مطلق العنانیت، ظاہری رکھ رکھاؤ، خود پسندی، حکمرانی، جبر و تشدد اور اپنی رائے میں من مانی وغیرہ کے وسواس ابھرتے ہیں اور انہی کی ترقی یا فتہ شکل کئی معاشرتی قباحتوں کا باعث بنتی ہے۔ اسی طرح جرثومۂ خمار "لذات جوئی، خود غرضی، مفاد پروری، حق تلفی، آرام طلبی اور تن آسانی وغیرہ کے وسواس کو جنم دیتا ہے اور بعد ازاں ان وسواس کی ارتقائی

صورت کئی عظیم فتنوں کا سبب بنتی ہے۔ اگر سالک اپنے اوپر نازل شدہ جملہ عارضی نعمتوں کو امانت گردانتے ہوئے انہیں مخلوقِ خدا کے تصرف میں لاتا رہے اور نفسانی "وقار و خمار" کی نفی میں مصروف کار رہے تو ان جرثوموں کا زہریلا شبہ اس کے لئے تریاق بن کر اُس کے روحانی جمود کو توڑ دیتا ہے اور صحرا نوردی اور ترک دنیا کی ضرورت درپیش نہیں ہوتی یہ عمل اس وقت پایۂ تکمیل کو پہنچتا ہے جب سالک کے قلب و ذہن میں فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ط (النسا۔۱۳۹) اور لَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِى الْمُلْكِ ط (بنی اسرائیل۔۱۱۱) کے حقائق پیوست ہو جائیں۔ یہ حقائق جب پیوست ہوتے ہیں جب وہ "مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا" کی عملی تفسیر بن جائے۔ وہ عملی تفسیر تب بنتا ہے جب اس کا قلب ذکر و فکر سے صیقل ہو کر انوار و تجلیات حق سے معمور ہو جائے۔ نیز اس کا قلب اس وقت صیقل متصور ہوتا ہے جب اُسے ہر حال اور ہر آن میں اس امر کا باطنی ادراک ہو جائے کہ ؎

دل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار
جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

یہاں تک کہ بعد ازاں اس پر "نمی دانم چہ منزل بود" کی کیفیت طاری ہو جائے۔

صحرا نوردی اور ترکِ دنیا اختیار کرنے والوں نے نفس کے مذکورہ حواس یعنی "وقار اور خمار" کا علاج ہر شئے کو خیر باد کہہ کے کیا۔ ایسے حضرات کا یہ محض ذاتی طرزِ عمل تھا جو بالکل دعوتِ تقلید نہیں دیتا۔ مذکورہ نوع کے روحانی انقباض کے علاج کے لئے جنگلات میں چلہ کشی یا ترکِ دنیا نہ ہی ضروری ہے اور نہ واجب۔ اسلام عین دینِ فطرت ہے اور غیر فطری

مجاہدات کی تلقین نہیں کرتا۔ علامہ اقبالؒ پر بھی تقریباً ایسے ہی انقباض سے مشابہ کیفیت کم و بیش عرصہ پانچ سال تک جاری رہی۔ اُن سے نعمتِ سوزچھن گئی لیکن انجام کار انہیں یہ نعمت مفقود اور گوہرِ مقصود اسلامی طریقت پر مبنی خانگی اور معاشرتی زندگی کی حدود میں ہی حاصل ہوگیا۔ ان پہ یہ راز باطنی طور پر واضح ہوگیا کہ دولت اثر و رسوخ شہرت کامرانیاں اور خوشں بختیاں فی الحقیقت منازل عرفان میں حائل نہیں بلکہ اصل رکاوٹ نفس پر پیدا ہونے والے ان کے غلط اثرات ہیں جو کہ نفس کے لئے غذا کا کام دیتے ہیں اور یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ ہے۔

(۴) طریقت کی آداب شکنی سے انقباض

راہِ سلوک میں آدابِ طریقت کی پاسداری ازبس ضروری ہے۔ بعض اوقات اہل سلوک طریقت کی آداب شکنی کی وجہ سے بھی عارضہ انقباض میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ آداب طریقت کی ایک قسم وہ ہے جس کا تعلق بزرگانِ دین کی عقیدت و احترام، حفظِ مراتب، محفلِ طریقت میں آدابِ مجلس اور آدابِ شیخ سے ہے۔ اکثر سالک حضرات ان سے آگاہ اور ان پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ آداب طریقت کی دوسری قسم وہ ہے جس کا تعلق کسی اہل سلوک کی باطنی کیفیات، مشاہدات اور اس کی انفرادی وارداتِ حال سے ہے۔ قلبی کیفیات، باطنی سیاحت اور عالم خواب میں بزرگ ہستیوں کے دیدار وغیرہ سے مشرف ہونے پر خواص و عوام کے سامنے ان کا بے مقصد تذکرہ اصولِ سلوک اور آداب طریقت کے خلاف ہے۔ سالک ایسی کیفیات سے بھی گزرتا ہے جن کی تشریح حاصل ہونا نہایت مشکل ہوتا ہے۔ بعض اعجازی کیفیات ہوتی ہیں جن کے سمجھنے میں عقل بے بس ہوتی

ہے۔ کسی بھی قسم کے باطنی مشاہدات کا بے محل اور غیر ضروری تذکرہ نفسانی خمار اور خود نمائی کے جذبات اجاگر کرتا ہے۔ ان پر بے مقصد تبصو شناسی وسواس کو دعوت دیتا ہے اور انجام کار سالک انقباض میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ خواص و عوام کی محفل میں اپنی باطنی کیفیات کی خواہ مخواہ قصہ گوئی طریقت و معرفت کی صریحاً آداب شکنی ہے۔

سے خموش اے دل بھری محفل میں چلانا نہیں اچھا
ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں

یہاں اس امر کی وضاحت کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ کسی سالک کو دوسروں کے سامنے کسی مسئلہ سلوک کی تبلیغی نقطہ نظر سے وضاحت کرنا پڑے اور اس سے متعلقہ اس مسئلہ کی تشریحی کیفیات اس پر گزر چکی ہوں تو ان کیفیات کی روشنی میں مطلوبہ مسئلہ حال کی تشریح کر دینا سالک کے فرائض میں داخل ہوگا۔ بشرطیکہ تشریح قرآن و حدیث سے متصادم نہ ہو اور کیفیات کی بے جا اور غیر ضروری تفصیلات سے بھی گریز کیا جائے۔

(۵) ناقابل ادراک وجہ سے انقباض یہ عجیب قسم کا انقباض ہوتا ہے جس کی حیثیت انقباض کی مذکورہ بالا چہار اقسام سے منفرد ہے۔ اہل طلب کو اس کی کوئی بھی حتمی وجہ دکھائی نہیں دیتی اور نہ ہی آن پر ظاہری باطنی اعتبار سے ایسے حالات وارد ہوتے ہیں جو اُن کی نگاہ میں مذکورہ بالا اقسام کی تفصیلات سے مطابقت رکھتے ہوں۔ روحانی جمود کی یہ کیفیت اچانک طاری ہو کر طوالت اختیار کر جاتی ہے۔ سالک کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ عارضہ انقباض میں مبتلا ہو چکا ہے۔ اس کی پرواز جام اور سوز ختم ہو چکا ہے۔ لیکن خضوع و خشوع میں کوئی خامی کمی اور کسر درانہ

نتیجہ میں واضح نقص دکھائی نہیں دیتا۔ نفس سے محاسبہ کے باوجود اسے انقباض کی وجہ فہم و ادراک سے بالاتر محسوس ہوتی ہے۔ اس کا گوہرِ مقصود اس کی نگاہ سے اوجھل یا دھندلا ہو جاتا ہے اور اسے اس امر کا ادراک ہوتا ہے کہ اس کے نورِ بصیرت پر تاریکی چھا گئی ہے۔ ایسی صورتِ حال میں اس کے خضوع و خشوع اور اس کی بے سوز تڑپ میں بحد جنون اضافہ ہو جاتا ہے اور وہ اس الجھن میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ۔

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی! یہ ماجرا کیا ہے

طاری ہونے والی متغیرہ کیفیت کو از روئے طریقت اپنی کسی نامعلوم خطا یا خطاؤں سے منسوب کیا جاتا ہے۔ خطا شعوری طور پر بھی ہو سکتی ہے اور لاشعوری طور پر بھی۔ خطائیں قولی اور فعلی بھی ہوتی ہیں اور خناسی اور وسواسی بھی۔ اہلِ ظواہر کے نزدیک محض خناسی اور وسواسی خطا جس کا کسی مابعد ظاہری عمل سے تعلق قائم نہ ہوا ہو قابلِ گرفت نہیں لیکن اہلِ باطن کے نزدیک اس کا محاسبہ لازم ہے۔ نفسِ النساق سے پیدا ہونے والے ہر اس وسوسہ اور جذبہ کا باطنی طور پر محاسبہ ہوتا ہے جس نے کسی لمحہ سالک کے وجدان پر قبضہ کر رکھا ہو۔ اس عمل کا ردِ عمل حیاتِ عنصری میں سالک کی حیثیتِ مجموعی پر ہوتا ہے اور اس کی باطنی صفائی ہوتی ہے۔ اگر نفس سے محاسبہ کے باوجود کیفیت جمود و انقباض کا محرک سالک کے ادراک سے بالاتر ہو تو اسے ماجرا معلوم کرنے کا مالیخولیا فوری طور پر ذہن سے خارج کرنا پڑتا

ہے۔ اُسے اپنا مشن جاری رکھتے ہوئے اس امر کا خیال رکھنا ہوتا ہے کہ ایجاباً و احتساباً اس کے کردار میں کوئی نقص، فکر میں کجی، زبان پر بے لگامی اور خضوع و خشوع میں کوئی دراڑ نہ ہو۔ اپنے سالکانہ مشن میں محو حضرات مایوسی کا شکار نہیں ہوتے اور انجام کار جلد یا بدیر بامراد ہوتے ہیں۔

علاوہ ازیں عارفین کا نظریہ ہے کہ بعض اوقات سالکین کو مقامات ظلمات سے بھی گزارا جاتا ہے۔ مقام ظلمات میں بصیرت کی بجائے تاریکی اور جمود و انقباض کا احساس ہونا اس کی مقامی صفت سے وابستہ ہے یعنی جیسے حیاتِ ظاہری میں کسی تاریک مقام یا غار سے گزرتے ہوئے اپنی بینائی غیر مؤثر اور بیکار ثابت ہوتی ہے۔

یہاں اس تلقین کا اعادہ کرنا لازمی اور بہتر ہوگا کہ سالکین پر طاری ہونے والے ہر قسم کے روحانی جمود و انقباض کے تدارک کے لیے نسبت ظاہری کی جانب فوری رجوع لازم ہے اور اپنے شیخ طریقت کی خدمت میں بالمشافہ حاضری انتہائی ضروری اور مفید ہے۔ علاوہ ازیں ذکر حبس دم اور ذکر ضربی کا معمول بھی بہتر ثابت ہوتا ہے۔

٭ ٭ ٭

طبقات الاسفل

ظاہری اور باطنی کائنات میں منفی اور مثبت دو بڑی قوتیں ہیں جن کے بین بین ایک تیسری قوت بھی ہے جو بدرجۂ صفر ہے۔ نہ مثبت ہے نہ منفی، نہ نوری ہے نہ ناری۔ یہ ابنِ آدم کی قوت ہے، جس کے ساتھ ہر بڑی سے بڑی اچھی بُری قوت کا تعلق ہے۔ ظاہری اور باطنی ہدایت کے خزانے بھی اس کے ساتھ ہیں۔ اور کفر و ظلمت کی راہبر شیطانی اور نفسانی قوتیں بھی اس کی دامن گیر ہیں۔ ارشادِ ربانی ہے۔

اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ۝ (الدھر-۳)

علاوہ ازیں عقلِ سلیم کی نعمت اور انسانیت کا جوہر بھی اسی قوت کے ساتھ وابستہ ہے۔ انسانیت کا یہی جوہر خلیفۃ اللہ فی الارض یعنی آدم کا تاجِ خلافت ہے جس میں ابدی نورانیت کا وہ بے بہا گوہرِ یگانہ موجود ہے جس کی ہر کسی کو خبر نہیں۔ اگر اس جوہر کی قدر و منزلت اور صحیح حفاظت قائم رہے تو ابنِ آدم "خالص انسان" کی نمود ہے۔ ورنہ بصورتِ دیگر "نقصان" ہے۔ اور پھر یہ گوہرِ نایاب سالہا سال تک حاصل نہیں ہوتا ہے

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

قرآنِ حکیم کی روشنی میں حیاتِ ناسُوتی میں ہونے والے خسارے سے بچنے کے لئے انسان پر چار شرائط لاگو ہوتی ہیں۔ اولاً یہ کہ وہ ایمان لائے۔ دوم نیک اعمال کرے۔ سوم دوسروں کو حق کی تلقین کرے اور چہارم یہ کہ مصیبت کے وقت صبر کرے اور دوسروں کو صبر کی تلقین کرے۔ بمصداقِ قرآن۔

وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (والعصر)

(زمانے کی قسم: بیشک انسان خسارے میں ہے۔ سوائے اُن لوگوں کے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کئے اور ایک دوسرے کو حق (پر قائم رہنے) اور صبر کی تلقین کرتے رہے)

مذکورہ شرائط میں ایمان میں کاملیت سب سے مشکل شرط ہے کیونکہ حدیثِ پاک کی رُو سے ایمان بھی تین چیزوں سے عبارت ہے۔ یعنی زبان سے اقرار، دل سے تصدیق اور اعضا سے عمل کرنا۔ اس لحاظ سے ایمان عقائد، افکار اور اعمال تینوں چیزوں پر محیط ہے۔ ایمان کی کاملیت میں پیش آمدہ خطرات کا تصوّر حقیقت شناس انسان پر لرزہ طاری کر دیتا ہے۔ بقولِ علامہ اقبال ؎

چو می گویم مسلمانم بلرزم
کہ دانم مشکلاتِ لَا اِلٰہ را

نُورِ ایمان کو زندہ و تابندہ رکھنے کیلئے تن کی دنیا کے کئی سومنات پاش پاش کرنے پڑتے ہیں۔ کعبۂ دل کو خواہشات کے بُتوں سے پاک کرنا پڑتا ہے۔ سالک کو تصورِ شیخ کے ذریعے حواسِ خمسہ پر حق کی نگہبانی مسلط کرنا پڑتی ہے۔ اکلِ حلال صدقِ مقال، صبر و قناعت، توکل علی اللہ اور عملِ پیہم اُس کا شیوۂ حیات ہوتا ہے۔ عقلی، فکری، اعتقادی اور عملی طور پر سنّت کے اتباع میں رہنا پڑتا ہے۔ یہاں تک کہ زندگی یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اٰمِنُوْا کی عملی تفسیر بن جائے۔ ورنہ

بصورتِ دیگر ے

زباں سے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

جب تک قلب و نگاہ مسلمان نہ ہو جائیں، ایمان ناقص رہتا ہے، اور زندگی ایک ما بعد خسارے کی دلیل بنی رہتی ہے۔ دولتِ ایمان سے بے بہرہ اور صالح الاعمال نہ ہونے کی صورت میں انسان مقامِ انسانیت سے گر جاتا ہے، اور مرتبہ کے لحاظ سے ایسے شخص کا نچلے سے نچلے درجہ میں ارتداد لازم ہے۔ بقولہٖ تعالیٰ۔ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ ؕ یعنی ہم نے پھر اُسے پست سے پست درجہ میں لوٹا دیا۔ اگر کوئی مسلمان ہونے کا دعویدار عقلی، فکری، اعتقادی اور عملی اعتبار سے مدارجِ ایمان میں نقطۂ کمال کو نہ پہنچا ہو تو وہ جہد و زہد کے باوجود طویل مدت تک ایک کشمکش میں مبتلا رہتا ہے۔ اور حیاتِ ناسوتی میں اس کی نسبت باطنی طور پر طبقات الاسفل سے قائم رہتی ہے۔ انبیائے کرام اور پیدائشی معصومین کو چھوڑ کر ابتداء میں ہر سالک کا تعلق حیاتِ عنصری کے تقاضوں کے پیشِ نظر عموماً سالہا سال تک ان طبقات سے پیوستہ رہتا ہے۔ اربعہ عناصر کا عالم جس کا تعلق حیاتِ ظاہری اور عنصری سے ہے، عالمِ ناسوت کہلاتا ہے۔ ناسوت سے نیچے بھی طبقات ہیں جن میں عالمِ خبثوت اور عالمِ طاغوت انتہائی خطرناک اور پُر فریب ہیں۔ جب تک سالک کا تعلق ان دونوں پست طبقات سے منقطع نہیں ہوتا اس کی پرواز ناقص رہتی ہے۔ لہٰذا ان ہر دو مقامات سے کسی حد تک تعارف لازمی ہے کیونکہ اکتسابِ خیر کیلئے خطراتِ شر سے آگاہی راہِ سلوک کی بنیادی ضرورت ہے۔

خبثوت اور طاغوت

عالمِ خبثوت تحت الثریٰ سے وابستہ ہے اور عالمین کا درکِ اسفل ہے۔ یہ مکروہ اور ملعون

نفوس کی آماجگاہ اور خباثت کا ٹھکانہ ہے جو ہر قسم کی عقل سے عاری ہیں۔ یہاں بے قرار ارواحِ خبیثہ قسم قسم کی مذموم، مکروہ اور قبیح تخریب کاریوں میں مشینوں کی طرح مصروفِ کار ہیں۔ فسق و فجور کی ان مشینوں کے اوپر یٹر خناسین ہیں جو عالمِ طاغوت سے وابستہ ہیں۔ اور ایک بالاتر طاغوتی قوت کے القاء سے مختلف اقسام کی تخریب کاریوں کا مشن سرانجام دینے میں معاون بنے رہتے ہیں۔ عقل کا کوئی فلسفہ، طریقت کا کوئی وظیفہ، معرفت کا کوئی الہام اور وجدان کا کوئی مقام اہلِ سلوک کو خبثوت اور طاغوت سے مکمل طور پر متعارف نہیں کراتا اور نہ ہی حیاتِ عنصری میں ان مقامات سے مکمل تعارف کی ضرورت ہے۔ خبثوت کا تعلق نفسِ امارہ سے ہے، اور امارہ کی نسبت طاغوت سے۔ امارہ جامع الخبائث ہے۔ امارہ ایک ایسی اکائی ہے جس میں انتقالِ نفس کے کائناتی اصول کے تحت ان گنت امارہ جات کی اکائیوں کی شعاعیں خبثوتی قوتوں کے روپ میں مجتمع ہیں۔ اسی طرح ان گنت خناسین کی اکائیوں کی شعاعیں شیطانی اکائی میں اور لاتعداد شیاطین کی اکائیوں کی شعاعیں شیطانی وحدت میں مجتمع ہوتی ہیں۔ دنیاوی فروع کی تقدیر سازی میں طاغوتی قوتوں کا بہت بڑا عمل دخل ہے۔

طاغوت کا عالم نہایت وسیع و عریض ہے جو کہ تحت الثریٰ کی اتھاہ گہرائیوں کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہے اور دوسری جانب رفعتوں کے مجازی مقامات میں عالمِ لاہوت کے مجازی طبقات تک اس کا احاطہ ہے۔ انسان کی باطنی کائنات میں اس کا مکمل عکس موجود ہے۔ ایک سالک کی نگاہ میں یہ "کچھ نہیں" کی دنیا ہے جو عقلِ ناطقہ کے مکر و فریب اور خناسین کے اشغال سے بھرپور ہے۔ یہ خناسین آن کی آن میں عالمِ خبثوت میں داخل ہو کر خباثت کو قبیح حرکات، مذموم افعال اور امورِ فاسقہ کی ترغیب دیتے ہیں۔ یہ ترغیب وسوسۂ شر کہلاتی ہے۔ اگر سالک

اس کی فوری نفی نہ کرے تو امارہ اسے فوراً قبول کر لیتا ہے ۔ اور ایک نفسانی خواہش وجود میں آتی ہے۔ لہٰذا "لا" کی تلوار سے اس کی فوری نفی لازم ہے۔ کوئی وسوسہ "شر" "انسانِ خالص" کے مقام سے منسوب نہیں ہوتا بلکہ کسی خناس کی ترغیب ہوتا ہے۔

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝ مَلِكِ النَّاسِ ۝ اِلٰهِ النَّاسِ ۝ مِنْ
شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ۝ الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ
النَّاسِ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ۝

خناس شیطان کی برہنہ تلوار ہے جس کی توڑ پھوڑ اور نفی سیف اللہ سے ہوتی ہے۔ خبلوتی قوتوں کی باطنی ترغیب کے نتیجہ میں نفس میں پیدا ہونے والی پُرپیچ شاطرانہ چالیں تن آسانی، کاہلی، عیش مستی، مفاد پرستی، لذت جوئی، کبر و غرور، فسق و فجور اور ظلم و تشدد پر مبنی ہوتی ہیں۔ باغاتِ نفس کے یہ ثمراتِ نمو ایک بالاتر نظام تخریب کاری کے تحت طاغوتی قوتوں کی آبیاری سے پکتے ہیں اور طاغوتی قوتوں کی عملداری سے اترتے ہیں۔ لیکن بایں ہمہ ابنِ آدم کو اکثر اوقات اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا ہے نفس کا مکر پیچیدہ ہونے کے باوجود محدود ہے۔ کیونکہ اکثر اوقات گناہ کا احساس ہو جاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ تلافی ہو یا نہ ہو۔ لیکن شیطان کا مکر معاذ اللہ نہایت وسیع اور حدِ فکر سے بھی بالاتر ہے۔ شیطان بالواسطہ نفس بھی مکر کا سبب بنتا ہے۔ اور بلاواسطہ بھی۔ جب طاغوتی قوتیں نفس کو گناہ کی ترغیب دینے میں ناکام اور مایوس ہو جاتی ہیں تو یہ سالک کے عقائد پر حملے کرتی ہیں اور اس کی عقل و وجدان پر قبضہ جمانے کی پوری کوشش کرتی ہیں۔ تاکہ وہ باطل کو حق اور القائے شیطانی کو الہامِ صحیح، فتنہ کو ارشاد اور انتشار کو تبلیغ سمجھے۔ صبر کو بزدلی سے منسوب کرے۔ دین کو نئی نہج پر ڈھالنے کو خدمتِ خلق، فقر کو مبنی بر نمائش اور کشف و کرامات کو مکمل فقر تصور کرنے لگے۔ طاغوت کے اس نوع کے آخری حربوں سے صرف وہی بچ سکتا ہے جس پر مالک کا خاص لطف و کرم شاملِ حال ہو۔

راہِ سلوک کا سفر کرنے والے اکثر سالکین کو ان کی باطنی کائنات سے متعلقہ

عالم خبثوت اور عالم طاغوت کے مختلف مقامات کے عکس کی بھی مشاہدہ بینی کرنا پڑتی ہے۔

عالم جذب وجنوں یا متوازن وغیر متوازن استغراقی حالت میں کسی سالک کی نظر میں کسی انسانی حیوانی یا کسی نوع کے دیدہ ونادیدہ پیکر کے ہیولے کا سامنے آنا گاہِ جذب کی فریب خوردگی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ خواہ وہ ہیولا متکلم ہی کیوں نہ ہو۔ خبثوت اور طاغوت کی شعاعوں کے انعکاس وانعطاف اور باہمی امتزاج سے معرضِ وجودِ بے وجود میں آنے والی یہ کچھ نہیں کی دنیا ہے جو کہ اکثر اوقات سالک کو وہم الیقین میں لا ڈالتی ہے اور وہ کئی غیر شائستہ حرکات کر بیٹھتا ہے۔ ایک سالک نے ایک دوسرے سالک سے مشورہ طلبی کے لئے اپنی سرگذشت یوں بیان کی کہ جب وہ نماز وغیر یا کسی دیگر عبادتِ خاص میں مشغول ہوتا ہے تو اُس کے سامنے گدھا یا ایسی ہی قسم کے گھٹیا جانور آجاتے ہیں جو اُسے تنگ کرتے ہیں اور اُس کا خضوع وخشوع ٹوٹ جاتا ہے۔ دوسرے صاحب نے جواب دیا "یہ شیطان ہوتا ہے۔ جب تم اُسے دیکھو تو اُس پر تھوک دیا کرو۔ وہ بھاگ جائیگا" چنانچہ اُس نے یہ نسخۂ نصیحت بہت معقول جانا اور بعد ازیں ایسی کیفیت وارد ہونے پر بحالتِ نماز ہی ادھر اُدھر تھوکنا شروع کر دیا۔ شیطان ہوتا تو وہ بھی اس لعابی گولہ باری سے نہ بھاگتا۔ مگر یہ تو ایک عکس تھا جو لاحول سے بھی نہ جا سکتا تھا۔ لہٰذا وہ اس حرکت سے الٹا دیگر نمازیوں کی لعن طعن کا نشانہ بنا۔

سالکین میں بعض حضرات کو جذب کا دور شروع ہونے پر مذکورہ قسم کے عکس کے علاوہ لغویات اور بیہودہ کلامی پر مبنی آوازِ دل کا سنائی دینا بھی امکانی امر ہے۔ یہ اُس مقام کی صدائے بازگشت ہوتی ہے جس کا تعلق سالک کے نفس کے ساتھ وابستہ ہو۔ یقین کیا جائے کہ نفی اثبات میں رواں دواں سالک کے لئے "یہ کچھ نہیں" کی دنیا ہے جس کا ادراک سراپا مجاز واعجاز ہے۔ اس مقام پر کسی سوچ کی بجائے سالک کو اپنے وجود کی نفی کی ضرورت درپیش ہوتی ہے۔ اور ہر جذبہ کی نفی کرنا پڑتی ہے تاکہ اُس کا قدم اثبات کی طرف بڑھتا جائے۔ سالک کا کسی وقت اس وہم الیقین میں مبتلا ہو جانا بھی خارج از امکان نہیں کہ

جنتوتی اور طاغوتی قوتوں کے موہوم پیکر اُس کے ساتھ پراگندہ طرزِ تکلم اور لغو کلامی سے مخاطب ہیں۔ یہ اندازِ فکر محض اُس کے وجدان کی غریب خوردگی کا آئینہ دار ہے۔ جب سالک پر کلمہ کے انوار وارد ہوتے ہیں اور تصورِ شیخ میں نفی اثبات سے اُس کے جہانِ دل میں کسی آنِ حق نما کا ظہور ہوتا ہے۔ تو اس کے ردِ عمل کے طور پر ان قوتوں کا ماقبل کی بھگت کی بجائے باہمی ٹکراؤ شروع ہو جاتا ہے۔ اس مجازی اور اعجازی کائنات میں ایک جنگ چھڑ جاتی ہے۔ یہ قوتیں آپس میں ہی لغو کلامی سے مخاطب ہوتی ہیں اور ان کی ان میں سالک کے وجدان پر قابض ہو کر اسے اس وہم میں گرفتار کرنے کی کوشش کرتی ہیں کہ ان کی ہر بات اُس سے منسوب ہے۔ نیز طرہ اس پر یہ کہ عالمِ خیال کی شعاعوں میں ضم ہو کر ایسی برائی کا تصور دے سکتی ہیں جس کا دنیا میں کوئی بھی شخص ارتکاب کر سکتا ہو۔ طالبِ حق۔ سالک کا عشق ایسے ہر وہم سے گزر جاتا ہے۔ ہر جذبہ کی نفی کرتے ہوئے ہر خیال سے آگے بڑھتا ہے۔ لاالٰہ کی ضرب سے ہر معنوی خناس کا قلع قمع کرتا ہے۔ ہر خواہش کو نفس کی پکار اور ہر غلط ترغیب کو شیطان کی للکار تصور کرتا ہے نیز ہر آواز کو نفسانی اور شیطانی قوتوں کی صدائے بازگشت قرار دیتا ہے جو "کچھ نہیں" پر مبنی ہے۔

ابنِ آدم کی حیثیت سے سالک کے ذہن میں کسی ماسوائی وہم کا داخل ہونا کوئی عجیبہ نہیں۔ یہ ایک لاشعوری وقوعہ ہے۔ لیکن تصورِ شیخ میں "لا" کی تلوار سے اس کی فوری نفی مطلوب ہے۔ کیونکہ ابنِ آدم کے ارتقائی مقامات میں "انسانِ خالص" کا بھی مقام ہے جس کا مشن فقط اطاعت و نیابت ہے۔ یہی مقام ظاہری باطنی کائنات میں اطاعتِ کاملہ اور خلافتِ در اصلہ کا صحیح نمونہ ہے جہاں کسی وہم و وسوسہ، خیالِ باطلہ نفسانی و شیطانی خواہش یا کسی نوع کی عملی، قولی اور فکری لغزش یا شرک کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہی مقام جہادِ زندگی میں انسانیت کا "نشانِ حیدر" ہے۔ عاشق سالک تصورِ شیخ میں اپنے وجود کی نفی کرتا ہے بلکہ ذکر میں "لا اِلٰہ" کے الفاظ سے

شیخ سمیت ہر شے کی نفی کر جاتا ہے۔ اور "اِلَّا اللّٰہ" کے الفاظ سے قلب پر ضرب لگاتے ہوئے جانبِ قلب رجوع کرتا ہے۔ تصور کے انوار سے اس کا قلب صیقل ہوتا ہے۔ اور عرفانِ حقیقت کی نمود ہوتی ہے۔ جب تک سالک کو نفسانی انانیت کا احساس رہتا ہے، اُس کی پرواز میں رکاوٹ قائم رہتی ہے اور خیالاتِ باطلہ، جذباتِ فاسقہ، رجحاناتِ خبثوتی، ترغیباتِ طاغوتی اور وسواسِ خناسی اُس کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ لہٰذا کیوں نہ سرے سے ہی اِن چیزوں سے انکار کر لیا جائے اور یہی تصور کر لیا جائے کہ کعبہ کو اِن بتوں سے بہت دُور کی نسبت ہے۔ اس وجہ سے کہ سالک "انسانِ خالص" کے مقام کی طرف رواں دواں ہوتا ہے۔ اور اس مقام سے ان چیزوں کا کوئی واسطہ نہیں۔

ایک سالک سے ملاقات پر انہوں نے اپنی سرگذشت یوں بیان فرمائی کہ "مجھ پر جب حفظِ مدارج اور دیگر کئی قسم کے اوہام وارد ہوتے ہیں تو میں توبہ کرتا رہتا ہوں۔ شیخ اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے بھی ڈالتا رہتا ہوں کہ مجھ پر ایسے وسواس وخیالات وارد نہ ہوں"۔ یہ طرزِ عمل از روئے طریقت درست ہے اور اس کا بجا لانا ضروری ہے کیونکہ ایسی کیفیت، نفسانی انانیت یا "میں" کے احساس پر وارد ہوتی ہے۔ لیکن باطنی معاملہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ سالک کی نفسانی انانیت مختلف اوقات میں مرتی جیتی، سوتی اور جاگتی رہتی ہے۔ لہٰذا اگر کوئی سالک اوہامِ باطلہ یا خبثوت اور طاغوت کے عمل دخل سے خوف زدہ ہو کر اکثر اوقات استغفار میں ہی محو رہے تو خبثوت اور طاغوت سے کنارہ کش رہنے کے باوجود اس کا تعلق "مقاماتِ خوف" سے وابستہ رہتا ہے۔ وہ ملکوتی الجھن میں گرفتار رہتا ہے اور "کا خوف" کے "عَذَابِ جہنم" کے طبقات اس کے قریب ہونے کے باوجود اس سے کہیں دُور ہوتے ہیں۔ وہ نفسانی یا شیطانی انانیت کی گرفت سے

آزاد نہیں ہوتا۔ اور اس پر فنائیت کی کیفیت کما حقہٗ وارد ہونا بہت مشکل ہوتی ہے۔ عشقِ حقیقی کا یہی تقاضا ہے کہ اوّل تو اس نوع کے خیالاتِ باطلہ اور وسواس خناسی کا سرے سے ہی انکار کر لیا جائے۔ کیونکہ کفر سے کفر عین اسلام ہے۔ اور "انسانِ خالص" کا مقام محض اطاعت و نیابت ہے۔ لیکن خالص انسانیت کی طرف لے جانے والے پُر خطر سفرِ سلوک میں پیش آمدہ خطرات کے پیشِ نظر اگر یہ چیزیں کسی وجہ سے سالک کے وجدان میں داخل ہونے کی کوشش کریں تو "لا" کی تلوار سے ان کی فوری نفی کی جائے۔ اگر یہ اس کے باوجود حواسِ خمسہ کے چور دروازوں سے وجدان میں داخل ہو کر اس پر قابض ہو جائیں تو فوراً استغفار کیا جائے۔ بغرض ردِّ ماسوا کے لیے سورۃ الناس، سورۃ الکافرون، لاحول یا درودِ پاک بہت مفید نسخہ جات ہیں۔ اگر عین موقع پر کچھ پڑھنا یاد نہ رہے تو دم نہ کیا جائے۔ البتہ اچانک طور پر کوئی ایسا ورد کر لینا اصولِ طریقت میں سے ہے اور عادتاً بہتر اقدام ہے۔

مقامِ طریقت کے اس معمول سے گزر کر سالک فوراً معرفت و حقیقت کی طرف گامزن ہوتا ہے۔ اور اُسے یہ آئینہ حال میں محسوس ہوتا ہے کہ تمام تر اوہام باطلہ، خیالاتِ فاسقہ، افکارِ غیر لائقہ، منفی جذبات اور وسواسِ خناسی باطنی کائنات میں ماسوائی قوتوں کے عمل کا ردِّ عمل ہیں۔ یہ شیطانی اور نفسانی عناصر کے آلہ ہائے کار ہیں اور اصل مقام اطاعت و نیابت سے ان کا کوئی واسطہ نہیں۔ لہٰذا سالک کا ان سے آزمائشی تعلق ٹوٹتے ٹوٹتے ٹوٹ جانا ہی راہِ سلوک کا بنیادی تقاضا ہے۔ بموجب ارشادِ ربّانی۔

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا ۝ (المزمّل: ۸)

(اپنے رب کا ذکر کرو اور ہر طرف سے ٹوٹ کر اسی کے ہو جاؤ۔)

عالم طاغوت کی بعض دلفریب تجلیات، حیرت انگیز کیفیات اور پُر کیف مناظر اکثر اوقات کئی سالک حضرات کو وصل کا گمان بھی دیتے ہیں۔ یہ عقل کی حیرت اور عشق کی غیرت کا مقام ہے۔ یہ بھی مجازی یا اعجازی کائنات کے عکس ہوتے ہیں۔ اس نوع کی بعض کیفیات کو اگر کوئی سالک حدودِ طاغوت سے بالاتر بھی تصور کرے تو پھر بھی اُن کا طاغوت سے قریب یا دُور کا تعلق ہوتا ہے۔ یقین کیا جائے کہ یہ سب مقامات پھر بھی عواملِ طاغوت کی کمند کے دائرہ کار میں ہیں۔ کیونکہ جہاں طاغوتی عوامل کی دست اندازی نہ ہو وہاں ان کی کمند کی رسائی ہے۔ ایک سالک نے ایک رات غالباً کوئی خاص پُر کیف منظر دیکھا۔ اور صبح کو اعلان کر دیا کہ "میں آج سدرۃ المنتہٰی پر گیا ہوا تھا"۔ اس قسم کے بے معنی انکشافات نہ صرف دیگر حضرات کو تصوف پر تنقید کا موقع دیتے ہیں بلکہ الٹا سالک میں نفسانی خمار اور وقار کے جذبات برانگیختہ کرتے ہیں۔ نیز ان کا کسی سلسلہِ طریقت و حال سے کوئی تعلق بھی نہیں ہوتا۔ اہلِ نظر جانتے ہیں کہ "میں" کی سدرۃ المنتہٰی کیا ہے۔ جب نفسانی انانیت کا نفی شدہ جوہر شیطانی انانیت میں منتقل ہو جائے تو اُس وقت اچانک اور بے اختیاری کی حالت میں بہت کچھ دکھائی دیا جا سکتا ہے جو مجازی اور اعجازی واردات ہے۔ ایسی کسی کیفیت پر وصل کا گمان کر لینا سراسر غلط فہمی ہے۔ عشقِ حقیقی کا تقاضا یہی ہے کہ فوق العقل واردات و کیفیات پر خاموشی قائم رکھی جائے۔ ان پر باطنی طور پر شک کرتے ہوئے ان کی نفی کی جائے۔ اور بالاتر حقیقت کی طرف سفرِ سلوک جاری رکھا جائے۔ یہاں تک کہ تشکک مشق ہو جائے اور حق منکشف ہو جائے۔

کشف وکرامات

کشف وکرامات اولیائے کرام کو قدرت کی جانب سے ملنے والے عطیات ہیں جو ان حضرات کو عبورِ منازل میں ودیعت کئے جاتے ہیں۔ فقراء سے ان کا صدور ظاہری یا معنوی ہر دو رنگ میں ہوتا ہے۔ اور اچانک ہوتا ہے۔ ان کا صدور بجائے خود کوئی مقصد نہیں بلکہ عظیم تر مقصد کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اور مقامِ فقر فی الحقیقت ان ہر دو سے بالاتر ہوتا ہے۔ ذیل میں کشف اور کرامات پر جداگانہ عنوانات کے تحت اجمالاً روشنی ڈالی جاتی ہے۔

کشف کشف سے مراد کسی بات کا باطنی طور پر ادراک ہونا، روحانی وسائل سے کسی معاملہ کی معلومات ملنا۔ اپنے یا کسی فردِ دیگر کے بارے میں کسی چیز کا باطنی طور پر علم ہو جانا۔ یا کسی راز کا روحانی طور پر کھلنا ہے۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں ـ "راہِ سلوک کی پندرہ معرفت منازلِ عرفان ہیں جن میں پانچویں منزل کشف ہے۔ لیکن سالک کو عارفِ باکمال ہونے تک معاملات کشف پوشیدہ رکھنے چاہئیں"۔ حضرت موصوف کے مذکورہ بیان کی روشنی میں صاف ظاہر ہے کہ کوئی اہلِ سلوک صاحبِ کشف ہونے کی حیثیت سے واصل بحق اور عارفِ باکمال تصور نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اکثر حضرات صاحبِ کشف اور اہلِ حال ہونے کے باوجود انانیت کی معراج نہیں ہوتے اور مسافرِ سلوک ہونے کی حیثیت میں ابھی انہیں قدم قدم پر شیطانی اور خناسی مداخلت سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ مسافرِ سلوک کے لئے واردات وکیفیاتِ مکشوفہ سے بے اعتنائی رکھنا اور ان کا تذکرہ عام

نہ کرنا از بس ضروری ہے۔ کیونکہ وجودِ عنصری میں ماسوائی قوتوں کے عمل دخل کے سبب اکثر انکشافات بے مقصد یا کشف کا فریب بھی ہو سکتے ہیں۔ عالمِ مراقبہ یا عالمِ رویا میں اگر کسی سالک کو بزعم اس کے ہفت افلاک کی سیر بھی ہو جائے اور اُس پر حیرت انگیز انکشافات وارد ہوں تو پھر بھی اس امر کی کوئی سند نہیں کہ وہ انکشافات درست حقائق پر مبنی ہیں۔ البتہ ایسی کیفیت میں اگر سالک دورانِ پرواز سلوک یا تصورِ شیخ ہو یا عالمِ رویاء میں قدم بہ قدم مرشد کے ساتھ ہو تو اُس کے پاس ظاہری کی بجائے تاحدِ نظر باطنی تصدیق موجود ہے۔ مگر تصور کے بھی کثیر التعداد مدارج نکھار ہیں۔ اور ہر واضح تر نقش مدہم تر نقش کی نسبت زیادہ قرینِ حقیقت اور مداخلت سے زیادہ منزہ ہوتا ہے۔ لہٰذا کسی کا یہ ظاہری انکشاف یا باطنی احساس کہ اُسے یہ کچھ دکھایا بتایا گیا، میزانِ معرفت کی کسوٹی پر صحت کے اعتبار سے سو فیصد پورا نہیں اترتا۔ اور نہ ہی کسی کے پاس اس دعویٰ کی دلیل و جواز یا اس امر کا ثبوت ہے کہ وہ تصور کے واضح ترین نقش و نگار اور نقطۂ عروج پر کے نکھار سے یک رنگ یا ہمکنار ہونے کے بعد سیاحتی اور معلوماتی مکشوفات سے بہرہ ور ہوا۔ بعض اہلِ سلوک حضرات اِس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ عالمِ مراقبہ یا عالمِ رویاء میں دیکھی جانے والی شبیہہِ شیخ اپنے نکھار کا اکمل نمونہ ہے۔ حالانکہ تصور کے کثیر التعداد مدارج ہیں ہر واضح تر تصور حقیقت میں مزید نکھار کی عکاسی کرتا ہے۔ یہاں تک کہ شیخ کی من و عن شبیہہ پاک کی نورانی تجلیات کے بھی مدارج ہیں اور معاملہ آگے بھی چلتا ہے۔ حدیث سے ثابت ہے کہ حیاتِ ظاہری میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی شبیہہ پاک کی نورانیت متعدد پردوں میں ملبوس تھی تاکہ صحابۂ کرام دیدار کے متحمل ہو سکیں۔ بایں ہمہ تفصیل مسافرِ سلوک کیلئے اس حقیقت سے بھی آگاہ رہنا لازمی ہے کہ تصور کی نورانی تجلیات کے تدریجی مراحل کے پیشِ نظر کسی مقام پر وارد ہونے والے تصور کا بحیثیت

تصورِ شیخ ناقص ٹھہرا لینا تصور کی ارفع نورانی تجلّی کو ناقص ٹھہرا لینے کے مترادف ہے ۔ مرشد ہمیشہ کامل ہوتا ہے ۔ مگر شبیہہِ پاک کے نورانی نکھار میں کمی سالک کے اپنے روحانی مقام میں کمی اور نقص کی دلیل ہوتی ہے ۔

یہ اہلِ حال حضرات کا متفقہ نظریہ اور مسلّمہ امر ہے کہ اگر کسی سالک کو پیش آمدہ معاملاتِ مکشوفہ ظاہری شواہد و واقعات کے مطابق درست ثابت ہو جائیں تو پھر بھی یہ ولایت میں کاملیت کی قطعی دلیل نہیں کیونکہ مقامِ فقر کشف و کرامات سے بلند ہے ۔ اور سالک کا مقصود کشف نہیں ۔ نیز مکشوفات کی تشہیر عموماً سالک کی رفتار پر جمود طاری کر دیتی ہے ۔ مسافرِ سلوک کے ذہن میں اپنی روحانی کم مائیگی اور تشنگی کا احساس اس کی منزل کو رواں دواں رکھتا ہے ۔ اور طلبِ حقیقت اُسے کشف سے بے نیاز رکھتی ہے ۔ یہاں اس امر کی وضاحت بے محل نہ ہوگی کہ کسی فرد کو سفلی علوم سے حاصل ہونے والی معلومات کا روحانی کشف اور راہِ سلوک سے کوئی تعلق نہیں ۔ خواہ وہ معلومات واتفاقی طور پر من وعن درست ہی کیوں نہ ثابت ہوں ۔

کراماتِ اولیاء

عارفین کے نزدیک اولیائے کرام سے صادر ہونے والی کرامات دو قسم کی ہیں ۔ قسمِ اوّل کراماتِ ظاہری کہلاتی ہے اور قسمِ دوم کراماتِ معنوی کے نام سے موسوم ہے ۔ ظاہری کرامات اولیائے کرام کی روحانی عظمت کے باعث وقوع پذیر ہونے والے ایسے واقعات و شواہد ہیں جن کے عمل میں آنے سے ناظرین و سامعین کی عقل دنگ رہ جاتی ہے ۔ یہ واقعات و شواہد اُن کی ولایت کی مشاہداتی اور تجرباتی شہادت دیتے ہیں ۔

معنوی کرامات اولیائے کرام کے گفتار و کردار اور اعمال و حرکات

کے ایسے خارجی تاثرات ہیں جو علمی، عقلی، دینی، وجدانی یا واردات طور پر اُن کی ولایت کی دلالت و وکالت کرتے ہیں۔ ہر دو قسم کی کرامات صوفیائے عظام اور اولیائے کرام سے قدرتاً صادر ہوتی ہیں۔ اس سلسلہ میں اِن حضرات کے نفس کو کوئی دخل نہیں۔

مسافر سلوک ہونے کی حیثیت میں کسی سالک کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوتا کہ اُس سے بھی کسی کرامت کا صدور ہو تاکہ وہ خود یا کوئی فردِ دیگر اس کے مقام سے متعارف ہو، اصولِ طریقت کے سخت خلاف ہے۔ ایسے خیال کی فوری نفی لازم ہے۔ اگر بالفرض کوئی ایسی واردات اچانک صادر ہو جائے جسے کرامت پہ قیاس کیا جا سکتا ہو تو اصولِ طریقت کی رُو سے اسے محض اتفاقی وقوعہ سے تعبیر کیا جاتا ہے یا اسے اپنے مرشد سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اور اس کے بے مقصد اظہار سے انتہائی گریز کیا جاتا ہے۔ سالک کے عارفِ باکمال ہونے سے پیشتر کسی بھی مرحلہ پہ اُس سے کسی کرامت کا صادر ہونا درخت کے کچے پھل کے مترادف ہے جو تیز ہوا اور آندھی کے زور سے زمین پہ گر جائے یا جسے پرندے کاٹ نوچ کر زمین پر پھینک دیتے ہوں۔

یہاں یہ حقیقت بھی پیشِ نظر ہو کہ کرامات سے مشابہت رکھنے والی کئی ایسی شعبدہ بازیاں بھی ہیں جنہیں عملیات کے اثر، نگاہ کے فریب اور ہاتھ کی صفائی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کئی نقلی پیر اور عامل افراد قبضہ جنات، تسخیر ہمزاد اور مختلف سفلی علوم کی چِلہ کشی کرنے کے بعد سادہ لوح عوام کی توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں اور مختلف قسم کی شعبدہ بازیاں دکھاتے ہیں۔ یہ چیزیں راہِ سلوک کا قطعی حصہ نہیں +

الہام

الہام سے مراد کسی نبی یا عارفِ باکمال پر اس کے قلب کی معرفت کسی ہدایت سے متعلقہ وہ القائے ربانی ہے جو حسانی محسوسات، ظن وتخمین اور کسی نوع کے وہم الیقین سے منزہ ہو اور حق الیقین کے نور سے اس کا ادراک ہو۔ انبیائے کرام وحی اور الہام ہر دو قسم کے پیغام والقائے ربانی سے مشرف ہوئے لیکن غیر نبی کے لئے جو عارف باکمال ہو، وحی کا دروازہ بند اور الہام کا راستہ کھلا ہے۔

انبیائے کرام کے ملہم من اللہ ہونے سے کسی کو انکار نہیں۔ ان حضرات نے اپنے الہامات باقاعدہ طور پر ظاہر کئے۔ اکثر نبیوں نے نادیدہ خدا کو نہ ماننے والوں کی تسکین کیلئے بحکم ورضائے الٰہی معجزات بھی دکھلائے۔ بعض انبیاء نے اپنے سے پہلے مبعوث ہونے والے نبی کی تبلیغات جاری رکھیں یا اپنے بعد آنے والے نبی کی بعثت سے آگاہ کیا۔ حتّٰی کہ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت عمل میں آئی اور آپ ایک مکمل اور عالمگیر ضابطۂ حیات لے کر عالمِ شہادت میں رونما ہوئے۔ آپ نے قرآن وسنّت کے ثقلین سے انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط ایک جامع اور رہنما دستورِ حیات پیش کیا۔ لہٰذ حضور سے روحانی طور پر بلاواسطہ یا بالواسطہ فیضیاب ہونے والے متاخرین، عارفینِ اسلام اور اہلِ حال حضرات کے لئے اس امر کی قدرتی طور پر چنداں ضرورت نہ رہی کہ انہیں اشاعتِ دین اور اصلاحِ عوام کے لئے لازماً الہامات ہی ہوتے رہیں۔ کیونکہ قرآن وسنّت موجود ومحفوظ ہیں اور ان سے بڑھ کر کوئی سند نہیں۔ تاہم جن عارفینِ باکمال کو خصوصی کیفیات میں رازِ دنیاز پر مبنی یا ہدایت کے پہلو سے متعلقہ الہامات ہوئے، انہوں نے ان کی من وعن تشہیر سے گریز کیا۔ مگر

بموجب ضرورت اپنی الہامی واردات وکیفیات کے پیچیدہ و پیچیدہ نکات کو رشد وہدایت کے لئے اپنے اقوال کے رنگ میں پیش کر دیا۔ جن حضرات کے جو الہامات کتب تصوف کی غیر مستند روایات سے ہم تک پہنچے ان میں سے اکثر غیر مصدقہ ہیں اور ان حضرات کے مریدین ومعتقدین کی مبالغہ آرائیوں سے ملوث ہیں۔ کسی ولی کی استغراقی حالت میں اس کی زبان سے نکلے ہوئے چند ذو معنی کلمات کو الہام سے تعبیر کرتے ہوئے کتب در کتب ان کی تشہیر کرنا اور اس امر سے بے خبر رہنا کہ پڑھنے سننے والے ان سے کیا مطلب اخذ کریں گے، کوئی دینی خدمت نہیں۔ یہ طرزِ عمل بعض اوقات دین میں تفرقہ اور رخنہ اندازی کا سبب بن سکتا ہے۔ ایسے ہی بعض معاملات نے علمائے ظواہر کو تصوف پر تنقید کا موقع دیا۔ ایسے ہی بعض حوالہ جات کو بطورِ استدلال پیش کرتے ہوئے الہام کا کوئی دعویدار اپنے اوپر وارد ہونے والے سلسلِ القائے شیطانی کو بطور الہامات پیش کر سکتا ہے۔ فتنہ قادیانیت اس امر کی روشن مثال ہے۔

الہام کی نزاکت اگر سُنی سُنائی روایات پر آمنا وصدقنا کہنے والے اور کتابوں کے حوالہ جات کے مفہوم سے بے خبر لکیر کے فقیر افراد جاہلانہ عقیدت مندی کے پیشِ نظر کسی اہلِ سلوک یا الہام کے کسی دعویدار کے قول کو مبنی بر الہام تصور کرتے رہیں یا اس کے وجہ بیان کو نہ سمجھ سکیں، اور الہام کی نزاکت و مقصدیت کے پہلوؤں سے بے بہرہ رہیں تو فتنہ قادیانیت سے بڑھ کر کوئی عظیم تر فتنہ بھی کھڑا ہو سکتا ہے۔ اگر اس سے پیشتر کوئی شخص ظلی و بروزی نبی بنا تو بعد ازیں کوئی فردِ دیگر دجالی روپ دھار کر ظلی و بروزی خدا ہونے کا دعویٰ بھی کر سکتا ہے۔ فتنہ دجال کی وضاحت کے بارے میں علمائے محققین کی رائے میں اختلاف ہے۔ کوئی اسے ایک اجتماعی فتنہ تصور کرتا ہے، جو من حیث الجماعت کسی قوم یا خطہ زمین کے افراد کی

طرف سے اُن کی شر انگیز سائنسی ترقی اور ایٹمی قوت کے بل بوتے پر اسلامی نظریہ
توحید کے خلاف کھڑا ہوگا۔ یا روحانیت کے خلاف مادہ پرستی کی طبعی للکار ہوگا۔
اور عام افراد کے نورِ ایمانی کے انقباط کا باعث ہوگا۔ کوئی کہتا ہے کہ دجال
کسی وقت کوئی شخص بھی ہو سکتا ہے جو دین میں رخنہ اندازی اور مسلمانوں میں
نفاق کا موجب ثابت ہو۔ نیز یہ کہ ایسے دجال وقتاً فوقتاً اُبھر سکتے ہیں۔
بعض حضرات عام دینی روایات کی روشنی میں فردِ واحد کو اس کا سرغنہ ٹھہراتے ہیں۔ بہرحال
اس بحث میں الجھنا نفسِ مضمون سے غیر متعلقہ ہے۔ اگر بالفرض یہی تسلیم کر لیا جائے
کہ یہ فردِ واحد کا ہی پیدا کردہ فتنہ ہوگا جو خدائی دعوی کریگا تو یقینی امر ہے کہ آج کل
کے سائنسی اور مادی لحاظ سے ترقی یافتہ دور میں، جبکہ بعض افراد صحیح خدا کو بھی خدا نہیں
مانتے کوئی حکمران، سپہ سالار، سائنس دان، جادوگر یا کوئی ماہر عملیات اپنی قوت یا
کرشمہ سازیوں کے بل بوتے پر خدائی دعوے کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

ایسی صورتِ حال میں اگر کوئی ہوگا تو فقط بصورتِ درویش ہی ابھر سکتا ہے جس کے دستِ
تصرف میں مؤثر شیطانی قوتیں ہونگی۔ وہ علومِ شیطانیہ میں کامل ہوگا۔ بے دینی کا طوفان
بپا کرنے والے نت نئے شعبدے دکھلائے گا۔ لوگ اس کے سفلی عملیاتی کشف و
کرامات کی وجہ سے اس کے تابع ہونا شروع ہو جائیں گے اور بُری طرح
متاثر ہوں گے۔ عین امکانی امر ہے کہ وہ خود کو فنا فی اللہ ظاہر کرتے ہوئے
بتدریج ظلی اور بروزی خدا ہونے کا دعوے کرے۔ یہاں تک کہ اعلانِ عام کر دیتا ہے کہ وہ خداتعالی
کا مکمل اوتار، اوتاد، ظل اور بروز ہے نیز یہ کہ اس میں ذاتِ پاک مکمل اور کلی صفات کے ساتھ
حلول کر آئی ہے۔ پھر کوئی تعجب نہیں کہ ایسا شخص اپنے دعوی کی تصدیق و حمایت میں یہ دلیل پیش کرے کہ،
"تمہاری ہی کتابوں میں لکھا ہے جسے تمہارے بعض افراد الہامی کلام سے کم درجہ نہیں
دیتے کہ "اللہ اللہ گوکہ اللہ می شوی" یعنی اللہ اللہ کہہ یہاں تک کہ تو

اللہ ہو جائے ۔ چنانچہ میں نے ایسے ہی کیا اور اللہ ہو گیا۔ لہٰذا ماننا چاہیے کہ میں اللہ ہوں ۔ نیز یہ کہ تمہارے ہی ایک صوفی شاعر کا بیان ملتا ہے

من خدا ام من خدا ام ، من خدا
فارغم از بغض و کینہ و الہوٰی

اسی طرح میں بھی بغض و کینہ اور ہوائے نفس سے مبرا ہو چکا ہوں ، لہٰذا میں نے اگر ایسا دعویٰ کر دیا تو کونسی نئی بات ہے ۔" نعوذ باللہ من ذالک ۔ الہام کی انتہائی نزاکت کے پیش نظر سالک کے لئے کسی بھی الہامی نوعیت کی باطنی کیفیت کو عین القاء سے ربانی اور الہام صحیح پر مبنی تصور کر لینا اس کی شدید غلط فہمی ہو گی ، خواہ وہ کیفیت اس پر کیوں نہ مرشد پاک کے تصور سے ہی وارد ہوئی ہو ۔ اس لئے کہ اس سلسلہ میں سالک کے باطنی مقام ، تصور شیخ کے تدریجی مراحل اعجازی کیفیات ، مسلکہ منازل ، اور نفسانی اور شیطانی قوتوں کے کھیل تماشوں کا بہت بڑا دخل ہے ۔

ہزار نکتے ہیں ، کتاب دل کی قرأت میں
تری شراب میں عجب خمار ہے ساقی

ایک شخص کا واقعہ ہے کہ اس نے جذب و جنون کی حالت ہوش میں اپنی ایک معصوم بچی کو ذبح کر دیا ۔ استفسار و تفتیش پر اس نے بتایا کہ اسے بحالت عبادت الہام ہوا تھا کہ وہ بھی ابراہیم علیہ السلام کی طرح اپنے بچے کی قربانی دے ۔ یہ القائے شیطانی تھا جس پر عمل کے نتیجہ میں ایک معصوم بچی کی جان پر غناسی تلوار چل گئی ۔ اسی طرح کا ایک اور دردناک سانحہ ۸ ، نومبر ۱۹۷۶ء کے روزنامہ جنگ میں بھی نظر سے گزرا جس کے مطابق ایک مخبوط الحواس اور عبادت گزار شخص اپنی بیوی اور بچوں کو ذبح

کر کے اپنا مصلیٰ اُن کے خون سے داغدار کر بیٹھا۔ پولیس کے روبرو اُس کا بھی یہی بیان تھا کہ اُسے الہام ہوا اور قربانی دینے کے لئے کہا گیا۔ چنانچہ اُس نے اپنے خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے یہ اقدام کیا۔ جاہلانہ عقیدتمندی کے نتیجہ میں شیطانی طاقتوں سے اتنی بڑی فریب خوردگی راہ سلوک کا کس قدر حسرت ناک انجام ہے کہ منزل کا متلاشی تنزل میں جام ہو کر رہ جائے اور محرم بنتا بنتا مجرم بن جائے۔ عام صوفیاء تو درکنار حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ کو بھی شیطانی طاقت سبز باغ دکھانے اور ورغلانے کی کوشش سے باز نہ آئی۔ البتہ یہ الگ بات ہے کہ باری تعالیٰ کا فضل و کرم شاملِ حال ہونے کی وجہ سے وہ اُس کے جال سے بچ نکلے۔ لہٰذا سالک کے لئے مسافرِ سلوک ہونے کی وجہ سے بزعم خویش باوثوق ترین حالات میں بھی وارد ہونے والی الہامی نوعیت کی کیفیات پر جو کہ بالخصوص عقائد و نظریات کو خطرناک زد پر ڈالتی ہوں، خاموشی قائم رکھنا اور قلب و وجدان پر مسلط ہونے والے ایسے ہر معاملہ کی فوری نفی کرنا ازبس ضروری ہے۔

سلوک و عرفان کے سفر میں پیش آمدہ باطنی خطرات کے پیشِ نظر کسی اہلِ تصوف کے لئے یہ حتمی فیصلہ دینا محال ہوگا کہ طالبِ عرفان کو کونسے موڑ پر القائے شیطانی سے اچانک دوچار ہونا پڑتا ہے۔ طالبِ عرفان اپنے سفر کے نقطہ آغاز سے لے کر تاحدِ نظر مختلف ادوار میں کسی بھی مقام پر اس شیطانی حربے سے نبرد آزما ہو سکتا ہے۔ ایسا شخص جو کسی مستند سلسلہ کے بزرگ سے بیعت نہ ہو اور تصوف کے محض کتابی علوم کی روشنی میں ہی اس پُرخطر راہ پر چلنا شروع ہو جائے وہ کسی نہ کسی رنگ میں لازماً شیطان کے دامِ فریب میں گرفتار ہو سکتا ہے اور گوناگوں خوش فہمیوں کا شکار رہتا ہے۔ اور تو اور صحیح النسبت سالک بھی مالکِ حقیقی کے خاص کرم

کے بغیر القائے شیطانی کے گمراہ کن اثرات سے نہیں بچ سکتا۔

الہام سے قبل افہام عارفین کا انکشاف ہے کہ الہام کی ڈگری تک پہنچنے سے قبل مستغرق سالکین کو مراقبۂ جلوت، مراقبۂ خلوت یا مراقبۂ نیم خوابی کی حالت میں عرصہ دراز تک افہام کے مراحل سے گزارا جاتا ہے۔ اس کی تین اقسام ہیں۔ افہام پیچیدہ، افہام باطلہ اور افہام صحیحہ۔

افہام پیچیدہ:- اس کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب سالک پر مرشد پاک کے طفیل باطنی ہدایت کا دروازہ کھلتا ہے۔ لیکن کسی حد تک روحانی ترقی حاصل ہونے کے باوجود ابھی اس کا تعلق عالم خبثوت اور عالم طاغوت پر مشتمل طبقات الاسفل سے بخوبی پیوستہ ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ انبیائے کرام اور پیدائشی معصومین کو چھوڑ کر ہر سالک کا تعلق سالہا سال تک اِن طبقات سے پیوستہ رہتا ہے۔ چنانچہ دریں حالات وارد ہونے والے افہام میں اکثر اوقات پراگندگی کا التباس ہوتا ہے۔ ہدایت بڑے پُرپیچ انداز سے حاصل ہوتی ہے۔ کبھی ہدایت میں شیطانی قوتوں کی مداخلت ہو جاتی ہے، اور کبھی خنّاسی اشغال کے دوران ہی میں ہدایت حاصل ہو جاتی ہے۔

افہام باطلہ عموماً ایسی حالت میں ہوتا ہے جب سالک میں نفسانی مکر و فریب اور خبثوت کے تقاضوں کی نفی ہو جاتی ہے لیکن اُن کا نفی شدہ جوہر عالم طاغوت میں ضم ہو جاتا ہے۔ نفسانی مکر و فریب کے آتش کدہ کی راکھ شیطانیت کا شعلہ بن کر سالک کو پھر اپنی لپیٹ میں لینے کی کوشش کرتی ہے۔ مسافرِ سلوک اس افہام سے متاثر ہو کر بعض اوقات ایسے انکشافات کرتا ہے یا عارفانہ رنگ میں ایسے شعائر کی ترجمانی کر بیٹھتا ہے جو کہ قرآن و حدیث سے

متصادم ہوں۔ اگر وہ عالم دین ہوگا تو "بفیضِ ابلیس" ایسے عالمانہ دلائل کا نمائندہ ہو جائے گا جو قرآن وحدیث میں تاویلات کی عکاسی کرتے ہوں۔ اگر جاہل ہوگا تو اس افہام کے اثرات سے ایسے کلمات کے اظہار کا مرتکب ہوگا جو اس کی سادہ دلی اور نیک فطرتی کے عکاس ہونے کے باوجود دین کو نئی نہج پر ڈالنے کے مترادف ہوں۔ جب شیطانی قوتیں اہلِ سلوک کے نفس کو راہِ راست سے گمراہ کرنے میں ناکامی اور مایوسی میں مبتلا ہو جائیں تو وہ اپنے مشن کی تکمیل کے لئے اسی نوع کے آخری حربے استعمال کرتی ہیں۔

یہاں اس امر کی وضاحت کر دینا بھی ضروری ہے کہ اہلِ سلوک کے باطنی مقامات میں اتار چڑھاؤ ہوتا رہتا ہے۔ لہٰذا ضروری نہیں کہ مسافرِ سلوک افہامِ پیچیدہ کی کیفیات کے دور سے گزرنے کے بعد ہی افہامِ باطلہ کی کیفیات سے دوچار ہو۔ بعض اوقات ان ادوار کا باہم تغیر و تبدل اور تقدم و تاخر بھی ہو سکتا ہے۔ مسافرِ سلوک کی روحانی زندگی میں ہر لحظہ اس کے باطن سے متعلقہ کئی اعلیٰ اور ادنیٰ مقامات کی لہریں چلتی، مٹتی ابھرتی اور سمٹتی رہتی ہیں۔

افہامِ صحیحہ افہام کی نکھری ہوئی قسم ہے جس میں ہدایت واضح، پُر مغز اور سالک کی علمی، دینی، وجدانی اور روحانی بصیرت کی کاشف ہوتی ہے۔ یہاں نفسانی اور شیطانی قوتوں کی مداخلت ختم ہو جاتی ہے، لیکن بعض اوقات معاملاتِ مفہومہ میں مداخلت کا وہم ابھرتا ہے۔ عظیم صوفیا میں اکثر حضرات افہامِ صحیحہ ہی سے مشرف ہوتے ہیں جبکہ اُن کے اکثر و بیشتر معتقدین اُن کے اقوال کو الہام سے تعبیر کر لیتے ہیں۔ افہامِ صحیحہ کا اصل تعلق باطنی ہدایت سے ہے۔ اگرچہ اس میں بظاہر و باطن کسی پہلو سے کمی یا کجی دکھائی نہیں دیتی۔ لیکن بعض اوقات ایسے اشارہ جات کا اتفاق بھی ہو سکتا ہے جن پر عمل کا نتیجہ

خاطر خواہ اور تسلی بخش ثابت نہیں ہوتا۔ گو ان بن ظاہری یا معنوی طور پر نفسانی اور شیطانی مداخلت کی گنجائش نظر بھی آتی ہو۔

الہامِ صحیحہ

عارفین کے نزدیک الہامِ صحیحہ القائے ربانی ہے جس کی کیفیت عارف باللہ پر کلی فنائیت میں اچانک وارد ہوتی ہے۔ عظیم تصوفیوں کے اکثر و بیشتر اقوال القائے مرشدیت پر مبنی ہوتے ہیں جن کے بیان میں اُن کی ہونے نفس کو دخل نہیں ہوتا۔ لیکن ایسی القائی کیفیات کو شریعت و طریقت اور حرفت کی رُو سے القائے ربانی تصور کر لینا اور اُن کے بیانات کو کلامِ الٰہی سے منسوب کرنا شدید غلط فہمی ہوگی۔ "گفتۂ او گفتۂ اللہ بود" کا اظہار فقط عارفِ اکمل کے مقامِ فنی حق اللہ کا ترجمان ہے جس سے یہ مطلب اخذ نہیں ہوتا کہ ہر ولی کامل کا ہر آن میں بیان کردہ ہر قول عین القائے ربانی اور کلامِ الٰہی ہے۔ ورنہ اس کے انکار سے کفر لازم آتا۔ جو حضرات کبھی کبھار الہام سے بہرہ ور ہو چکے ہوں یا ہوتے ہوں انہیں بھی لبا اوقات انہام ہوتا رہتا ہے۔ کیونکہ ولی کے باطنی مقامات اور استغراق میں مد و جزر لازمی ہے اور حیاتِ ناسوتی کا ہر لمحہ ایک جیسا نہیں ہوتا۔

باایں ہمہ تفصیل یہ حقیقت اپنی جگہ پر قائم ہے کہ بعض صوفیائے عظام و عارفینِ باکمال بعض اوقات الہامِ صحیحہ سے بھی بہرہ ور ہوتے ہیں۔ انہیں حق الیقین کے نور سے اس کا ادراک ہوتا ہے اور کوئی ظن و قیاس اور وہم کا التباس باقی نہیں رہتا۔ اس کیفیت کا انعقاد فنا فی اللہ اور بقا باللہ کے مقام سے کسی بھی تجلی دیگری پر متصور نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ القائے ربانی اکمل فنائیت میں ہی ہوتا ہے۔ لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ الہامِ صحیحہ سے فیضیاب ہونے والے عارفین باللہ قولِ اسلاف "مَنْ عَرَفَ رَبَّهٗ فَقَدْ كَلَّ لِسَانُهٗ" کے مصداق خاموشی اختیار کر لیتے ہیں۔ اور اس کی من و عن تشہیر سے گریز کرتے ہیں۔ البتہ

اس القا میں ہدایت برائے عوام یا ہدایت برائے خواص کا پہلو ہو تو یہ حضرات اس کے مفہوم کو اپنے اقوال کے رنگ میں پیش کر دیتے ہیں۔ لہٰذا کسی بھی ولی کامل کے کسی قول کے بارے میں ہمارے پاس کوئی سند باقی نہیں رہتی کہ یہ کلام ربانی یا مبنی بر الہام تھا۔ یہ وہ نکتہ ہے جو نبوت اور ولایت میں امتیاز قائم رکھتا ہے۔

واضح رہے کہ کئی متصوف اور غیر متصوف حضرات مختلف قسم کے استخارہ جات سے حاصل ہونے والی معلومات کو بھی مبنی بر الہام قرار دیتے ہیں۔ یہ ان کی شدید غلط فہمی ہے۔ حالانکہ یہ وظائف کے نتیجہ میں مخصوص حالات میں وارد ہونے والے کسی مخصوص معاملہ کا غیر متصوفانہ کشف ہے جو صحیح بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی۔ اگر بالفرض یہ درست بھی ثابت ہو جائے تو پھر بھی اسے روحانی کشف و الہام سے ہرگز تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ امور دنیا میں وسواس کی نفی، دین میں کرامات کی نفی اور عشق میں الہامات کی نفی عارفین کا شیوۂ حیات ہے۔ کرامات انجام کار تبلیغ میں اور الہامات ابلاغ میں ضم ہو جاتے ہیں۔ اور عارفین میں اطاعت و نیابت کا مشن تا دم آخر باقی رہتا ہے۔

وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغ